دسمبر ۱۹۷۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ

ماہنامہ **میثاق** لاہور

جلد ۲۸	دسمبر ۱۹۷۹ء	عدد ۱۲

مشمولات

		صفحہ
★ درس سورۃ تکاثر	مولانا عبدالغفار حسن	۵
★ حیات طیبہ کا مکی دور	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۳
★ قرآن اور آثار کا لغات	محمد یونس جنجوعہ	۴۱
★ خطوط و آرا	قارئین میثاق	۶۰
★ نقد و تبصرہ	مرتب	۶۷

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852611 - 852683)

چندہ سالانہ -/۲۰ ———————— قیمت فی پرچہ -/۲

عرض احوال

تقریباً تین ماہ ملک سے باہر رہنے کے بعد، جن میں سے ڈیڑھ ماہ بلاد امریکہ میں گزرے اور ڈیڑھ ماہ دیار عرب میں، واپسی تو اگرچہ نومبر کے اوایل ہی میں ہو گئی تھی تاہم ایک تو اتنے مختلف بلکہ متضاد ماحول سے نکل کر سابقہ معمولات کی جانب رجوع میں ویسے بھی کچھ وقت لگتا ہے، بالخصوص مجھ ایسے شخص کو جو غیر ممالک کے سفر کا زیادہ عادی نہیں ہے۔ پھر یہاں تو بعض دوسرے اعتبارات سے بھی عظیم انقلاب حال واقع ہو چکا تھا۔ لہذا فطری طور پر طبیعت کو کام کی جانب مائل ہونے میں کچھ وقت لگا

مزید برآں درس و تدریس اور خطبہ و خطاب کا معاملہ تو دوسرا ہے کہ اس کی چکی از خود چلنا شروع ہو جاتی ہے اور اس میں بلا قصد و ارادہ بھی توانائیاں اور اوقات پسنے شروع ہو جاتے ہیں البتہ 'لکھنے' کا معاملہ مختلف ہے۔ 'خصوصاً' میرے لئے جو لکھنے کا نہ شائق ہے نہ مشاق چنانچہ اس کے باوجود کہ لکھنے کا ارادہ بہت کچھ ہے اور اس کا مواد ذہن میں لاوے کی مانند پکتا بھی رہا ہے ــــ تاحال قلم اٹھانے کی ہمت نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ کہ ع ''عجب دوگونہ عذاب است جان مجنوں را'' کے مصداق ایک جانب تو وہ مواد ذہن کا بوجھ بنا ہوا ہے اور دوسری جانب رفقاء و احباب بالخصوص قارئین 'میثاق' کے قرض کے احساس کا بارگراں ہے جو کمر کو توڑے دے رہا ہے ــ اس ضمن میں رفقاء لاہور کا قرض تو ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق یکم دسمبر ۷۹ء کو قرآن اکیڈمی کے چوتھے یوم تاسیس کے موقع پر منعقدہ تقریب میں ''امریکہ، مصر اور حجاز کے حالیہ سفر اور مولانا مودودی کے انتقال پر اپنے تاثرات'' بیان کر کے کسی حد تک ہو چکا ہے، البتہ بیرونی احباب کا قرض واجب الادا ہے ــــ جو انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور ادا ہو جائے گا۔

لاہور : ۵ دسمبر ۷۹ء　　　　　　　　خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

درس سورۂ تکاثر

مولانا عبدالغفار حسن

استاذ حدیث، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

(یہ درس مولانا موصوف نے جمعہ ۱۹- اکتوبر کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے کراچی آفس میں منعقد ہونے والے ہفتہ وار اجتماع میں دیا)

اس سورۃ کا نام سورۂ تکاثر ہے - اس لئے کہ اس سورۃ میں نمایاں لفظ تکاثر ہے - یہ لفظ قرآن مجید میں دو مقامات پہ آیا ہے - یہ سورۃ ہجرت سے قبل مکہ میں نازل ہوئی - یہ جو سورۃ مکیہ اور سورۃ مدنیہ لکھا ہوتا ہے تو سورۃ مکیہ سے مطلب ہے وہ سورۃ جو ہجرت سے قبل، اور سورۃ مدنیہ وہ ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی خواہ کسی مقام پہ نازل ہوئی ہو، سفر میں حضر میں، لیکن اس کو مدنی سورۃ کہا جائے گا - دوسری تشریح بھی کی گئی ہے - لیکن زیادہ قوی قول یہی ہے - اس سورۃ کی تفسیر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس میں جو مشکل الفاظ ہیں پہلے ان کی تشریح کردی جائے - مشکل سے مراد ایسے الفاظ ہیں جو قرآن میں بہت کم آئے ہیں - اس کے بعد ترجمہ اور پھر تشریح اور آخر میں ضروری اہم مباحث کا بیان ہوگا جن پہ یہ سورۃ مشتمل ہے -

یہاں اس میں پہلا لفظ اَلْهٰكُمُ ہے جو لوگ گرامر نہیں جانتے انہیں مغالطہ ہوجاتا ہے - وہ اَلْهٰكُمُ کا ترجمہ کردیتے ہیں "تمہیں ہلاک کیا" - حالانکہ اَلْهٰى الگ ہے - كُمْ الگ ہے - جس طرح آپ نے ابھی درس میں سنا لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا - بَلَا يَبْلُوْ یہ مجرد ہے - اسی طرح لَهَا يَلْهُوْ بھی ہے - اس کا مادہ لھو ہے اور اسی سے بنا ہے اَلْهَا - یہ عربی گرامر کے لحاظ سے باب افعال ہے - جیسے اَكْرَمَ (اَفْعَلَ) اَلْهَا وزن اَبْلَا - اَبْلَا يُبْلِيْ اِبْلَاءً - اَلْهَا يُلْهِيْ اِلْهَاءً - لَهْوٌ کے معنی آتے ہیں کھیل کود کے - یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن میں لَهْو کے ساتھ لَعِب کا لفظ بھی آتا ہے - اعلموا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ - لھو اور لعب دو

لفظ ہوئے۔ کہیں دونوں ساتھ آتے ہیں، کہیں صرف لھو کا لفظ آتا ہے اور کہیں صرف لعب کا لفظ آتا ہے۔ لھو کے معنی ہیں وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کردے۔ اور جو اصل حقیقی مقصدِ زندگی ہے، اس سے غافل کرکے بے مقصد کاموں میں مدہوش کردے۔ اسی معنیٰ میں سورۃ لقمان میں فرمایا گیا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (آیت: ۶) لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو لھو الحدیث خریدتے ہیں۔ یعنی ایسی باتیں خریدتے ہیں جو اللہ کی یاد سے، قرآن مجید سے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے غافل کرنے والی ہیں۔

'لھو' کے معنی کھیل کے ہیں یعنی وہ چیز جو اللہ کی یاد سے، اللہ کے ذکر سے، تلاوتِ قرآن سے، زندگی کے اصل مقصد سے غافل کردے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ ایسا ہوا ہے، جہاں 'لھو و لعب' ساتھ آئے ہیں۔ ایسی صورت میں 'لھو' سے مراد دل کا نسیان، دل کی غفلت — اور 'لعب' سے مراد ہے اعضاء و جوارح کسی کام میں، کھیل کود میں مشغول ہوجائیں۔ 'لعب' تو یہ ہے کہ ہاتھوں سے انسان کھیل رہا ہے، اپنے قدم آگے بڑھا رہا ہے یا آنکھیں استعمال کر رہا ہے یا کان استعمال کر رہا ہے تو یہ کام 'لعب' میں آجاتے ہیں۔ اور 'لھو' جو ہے وہ قلبی کیفیت ہوتی ہے اگر یہ دونوں ایک جگہ جمع ہوں تو 'لھو' سے مراد ہے قلبی کیفیت، یعنی غفلت کی یا نسیان کی حالت۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْهَتْنِيْ عَنْ صَلٰوتِيْ۔ یعنی پردے کے نقش و نگار نے میرا دھیان بٹا دیا۔ یہ چادر جو تھی اس نے میرا دھیان بٹ گیا تو دوسرا کپڑا لاؤ جو منقش نہ ہو، اس پر تصاویر

نہ ہوں، کوئی سادہ کپڑا لاؤ۔ یہ نماز کے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا۔ تو 'لھو' کے معنی نسیان، غفلت، دھیان کا بٹ جانا، بے پرواہ ہوجانا ہے، اور 'لعب' کے معنی ہیں ظاہری طور پر کھیل کود۔ لیکن اگر 'لھو' الگ آئے تو پھر ظاہری کھیل کود اور قلبی کیفیت دونوں مراد ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے قرآن مجید میں فقیر اور مسکین کا لفظ آتا ہے۔ "فقیر اور مسکین" دونوں لفظ اگر ساتھ ہوں تو "فقیر" وہ ہے جو بالکل محتاج ہے اور "مسکین" وہ ہے جو بالکل محتاج تو نہیں لیکن اس کی آمدنی اس کی ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ یہ فرق ہے مسکین اور فقیر میں۔ لیکن اگر "فقیر" الگ بیان ہو اور "مسکین" الگ تو پھر ایسی صورت میں "فقیر" وسیع معنوں میں بولا جائے گا مسکین کے معنوں میں۔ بہرحال یہ ایک مثال ہے۔ اسی طرح 'لھو و لعب' ہے۔ تو 'الھاکم' کے معنی ہوئے غافل کر دیا۔

دوسرا لفظ اس سورۃ میں ہے: تَکَاثُر۔ 'تکاثر' بنا ہے کثرت سے، اس کا مجرد آتا ہے کَثُرَ یَکْثُرُ (زیادہ ہونا، بڑھنا) 'تکاثر' بروزن تفاعل۔ تفاعل کا جو وزن عربی زبان میں آتا ہے اس میں مقابلہ پایا جاتا ہے، جیسے تقاتل یتقاتلون باہم لڑتے ہیں۔ مقابلہ ہوتا ہے اس میں۔ مقابلہ کی شکل میں جب کہ دونوں طرف سے مقابلہ ہو، اور برابر کی چوٹ ہو تو ایسی صورت میں تفاعل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی ہوئے مقابلہ کرنا۔ یعنی کس چیز میں مقابلہ؟ یہاں دراصل اردو زبان کی تنگ دامانی مانع ہے کہ 'تکاثر' کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جا سکے۔ یہ ایک لفظ میں نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر اس کی آپ تشریح کرنا چاہیں بلکہ ترجمانی کہہ سکتے ہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں "کثرت میں باہمی مقابلہ آرائی!" یہ گویا مفہوم ادا ہوا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کیا ہے: تمھیں غافل کر دیا بہتات کی حرص نے!" یہ 'تکاثر' کے معنی ہوئے۔

اس کے بعد ہے کَلَّا۔ کَلَّا کے دو معنی آتے ہیں۔ ایک تنبیہ کے لئے آتا ہے جس کو اردو زبان میں کہتے ہیں "خبردار" اور دوسرے معنی آتے ہیں "ہرگز نہیں!"۔ یعنی ماقبل میں جو بات کہی گئی ہے اس کی نفی کی جا رہی ہے۔

'سَوْفَ' کے معنی اردو میں عنقریب یا ابھی کے آتے ہیں۔ اس کے بعد لفظ آتا ہے 'علم الیقین' اور 'عین الیقین'۔ یہ دو لفظ آئے ہیں، اور ایک تیسرا لفظ آیا ہے

سورۂ حاقّہ اور سورۂ واقعہ میں - وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (سورۂ حاقّہ آیت ۵۱، ۵۲) اور اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (سورۂ واقعہ آیت ۹۵، ۹۶) - وہاں 'حقّ الیقین' آیا ہے - تو یہ تین لفظ ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے - علم الیقین کیا ہے ؟ اور عین الیقین کیا ہے ؟ اور حق الیقین کیا ہے ؟ - علم الیقین کے معنی پختہ علم جو ہمیں کانوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے - اور عین الیقین یہ کہ آنکھ سے آپ نے دیکھا - اور حقّ الیقین یہ کہ آپ خود اس معرکہ میں پہنچ گئے - اس کی مثال یوں دے سکتے ہیں کہ جیسے آپ نے سُنا ہوا ہے کہ شہد میٹھا ہوتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کرسکتا - سب یہ کہتے ہیں کہ شہد میٹھا ہوتا ہے، تو یہ ہے علم الیقین - اگر کوئی شخص کہہ دے کہ شہد پھیکا ہوتا ہے تو کہیں گے وہ جھوٹا ہے شہد پھیکا نہیں ہوسکتا - تو اس کے میٹھا ہونے پر اجماع ہے، تواتر سے یہ بات ثابت ہے، یہ علم الیقین ہے - لیکن آپ نے دیکھا کہ لوگ کھا رہے ہیں اور مزے لے کر کھا رہے ہیں کسی قسم کی کڑواہٹ یا کھٹّاپن یا پھیکاپن محسوس نہیں ہو رہا ہے - تو آپ نے محسوس کیا کہ یہ تو عین الیقین ہے، سامنے لوگ کھا رہے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں - اس کے بعد پھر آپ نے خود ہی چکھ لیا تو یہ ہوگیا حقّ الیقین کہ اب تو کچھ شک ہی نہیں ہوسکتا - اس طرح تین درجے ہیں یقین کے - اسی طرح کی اس کی دوسری مثال حج کے موقعہ کی لیجیئے، کتنے ہمارے بھائی ہیں جنھوں نے حج نہیں کیا ہے - لیکن وہ جانتے ہیں کہ بیت اللہ مکّہ میں موجود ہے اور مکّہ ایک شہر ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے آباد کیا تھا بوادٍ غیر ذی زرعٍ - تو وہاں اللہ کا گھر موجود ہے - آپ جانتے ہیں، سب جانتے ہیں، جنھوں نے حج نہیں کیا وہ بھی جانتے ہیں - تو یہ علم الیقین ہے - اس میں کوئی شک نہیں کرسکتا کہ حجاز میں (مکّہ میں) اللہ کا گھر موجود ہے - یہ علم الیقین ہے - اب اس کے بعد وہاں پہنچ گئے - آپ نے دور سے آنکھوں سے بیت اللہ کو دیکھ لیا تو یہ عین الیقین ہوگیا، اور جب احرام باندھ کر آپ طواف کرنے لگے اور آپ نے حجرِ اسود کو چومنا شروع کردیا تو اب یہ ہوگیا حقّ الیقین - اس کے بعد بھی اگر کوئی شک کرے تو اس سے بڑھ کر احمق اور غبی کون ہوگا ؟ تو یہ تین درجے ہیں یقین کے - علم الیقین، عین الیقین اور حقّ الیقین - سورۂ تکاثر میں دو درجے بیان کئے گئے ہیں، علم الیقین اور عین الیقین - اور حقّ الیقین کا بیان سورۂ حاقّہ اور سورۂ واقعہ کے آخر میں ہے -

آخر میں لفظ آیا ہے 'نعیم' ۔ نعیم کا لفظ کوئی ایسا مشکل لفظ نہیں ۔ یہ 'نعمت' کے معنی میں آتا ہے ۔ ترجمہ کرنے سے پہلے یہ بتلا دیا جائے کہ اس سورۃ کا بنیادی مضمون کیا ہے ؟ جہاں تک غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے سورۃ کا بنیادی مضمون ہے ـــــ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک بہت بڑی خرابی کی نشاندہی اور اس کے بعد اس کا علاج ـــــ نشاندہی بھی کر دی ہے اور ساتھ ہی اس بیماری کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بھی بتلا دیا اور آخر میں اس کا علاج ۔ تین چیزیں آگئیں ۔ بیماری' بیماری کا نتیجہ اور اس بیماری کا علاج ۔ یہ تین باتیں ہیں جو اس سورۃ میں آئی ہیں ۔ تو بیماری کیا ہے 'تکاثر' ۔ اس کا نتیجہ کیا ہے ؟ 'لہو' اور غفلت ۔ اور اس کا علاج کیا ہے ، وہ آخر میں بیان کیا جائے گا ۔ (آخری آیت کی تفسیر میں) ؛

اب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ، فرمایا : اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تمھیں غافل کر دیا تکاثر نے) کیا معنی ؟ یعنی کثرت میں باہمی مقابلہ آرائی نے ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (یہاں تک کہ جا دیکھیں تم نے قبریں) یہ ترجمہ ہے شاہ عبدالقادرؒ کا ۔ كَلَّا (خبردار) یا دوسرے معنی ہیں (ہرگز نہیں) ۔ یعنی یہ تمھاری روش ، یہ تمھارا طرزِ عمل غلط ہے ۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ (ابھی تم جان لوگے) ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تکاثر کا نتیجہ کیا ہے ؟ ثُمَّ (پھر) ثُمَّ تاخیر کے لئے آتا ہے ۔ كَلَّا (خبردار) ابھی تم جان لوگے ۔ یہاں دو دفعہ فرمایا : كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ اب بظاہر یہ تکرار کیوں ہے ؟ عام طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاکید کے لئے ہے اور غور کرنے سے ایک چیز ذہن میں آتی ہے خدا کرے صحیح ہو ۔ اگر صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ، اور اگر غلط ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے ۔ وہ یہ ہے کہ پہلا كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ اس دنیا میں ہے اور دوسرا ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ آخرت میں ہے ۔ خاص کر یہ اجتماعی تکاثر جو ہے ، اس کا نتیجہ دنیا میں ہی معلوم ہو جاتا ہے ۔ حقیقت میں انفرادی تکاثر بڑھتے بڑھتے اجتماعی تکاثر بن جاتا ہے ۔ یعنی یہ لازم نہیں ہے بلکہ متعدّی ہے ۔ تو اس لحاظ سے اس کو تکرار نہیں کہیں گے ۔ یہ محض لفظی تکرار نہیں ہے' قرآن مجید میں جو بھی لفظ مکرّر آیا ہے ، اُس میں بڑی حکمت ہے ۔ كَلَّا (خبردار) اگر تم جان لو ۔ لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۔ یقینی علم کے طور پر جان لو ، تو کیا ہوگا ؟ اس کا جواب مقدّر ہے جو سمجھ میں آجاتا ہے ۔ یہ محاورہ جب انسان سوچتا ہے اور قرآن مجید اور عربی زبان کے

اسلوب کو سمجھتا ہے تو یہ 'لو' کا جواب جو ذہن میں آجاتا ہے وہ ہے ما الھکم التکاثر یعنی لو تعلمون علم الیقین ٥ اگر تم جان لو یقینی علم تو کیا ہوگا؟ ما الھکم التکاثر تمہیں تکاثر غافل نہیں کرے گا، تم تکاثر میں مبتلا نہیں ہوگے۔ یہ معنی ہیں اور اسکی قائم مقام ہے: لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ۔ تکاثر میں مبتلا ہونے کا نتیجہ کیا ہے اُسے تم ضرور دیکھ لوگے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔ تم اسے دیکھ لوگے یقین کی آنکھ سے۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ۔ پھر تم اس دن پوچھے جاؤ گے نعمتوں کے بارے میں۔ یہ ترجمہ ہوا اِن آیات کا۔

اب اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ کی تفسیر میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں یہ نہیں بتایا کہ تکاثر کس چیز میں؟ اسے عام رکھا۔ تکاثر مال میں ہو سکتا ہے، تکاثر اولاد میں ہو سکتا ہے۔ تکاثر گروہ بندیوں میں ہو سکتا ہے، تکاثر امتوں اور قوموں میں ہو سکتا ہے۔ تکاثر انسان کے ڈیل ڈول میں ہو سکتا ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں، اسی لئے قرآن مجید نے عام رکھا۔ تمہیں غافل کر دیا تکاثر نے ——— اور یہ قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیم ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ اگر ایک جگہ اجمال ہے تو دوسری جگہ اُس کی تفصیل آئے گی۔ یہاں فرمایا: اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ کون سی چیز ہے غافل کرنے والی؟ کس چیز میں تکاثر ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ط وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ٥ (سورۃ حدید آیت ۲۰)— یہاں فرمایا: اِعْلَمُوْٓا جان لو کہ دنیاوی زندگی کیا ہے؟ کھیل کود ہے، غفلت ہے، لہو و لعب اور زینت و آرائش ہے وَتَفَاخُرٌ اور آپس میں تفاخر ہے، وَتَكَاثُرٌ اور تکاثر ہے، فی المال والاولاد۔ مال میں اور اولاد میں۔ انسان میں جب تکاثر پیدا ہو جاتا ہے تو مقابلہ مال میں ہوتا ہے کہ ہمارے پاس مال زیادہ ہے۔ یہاں ایک حقیقت اور بھی سُن لیجئے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ایک ہے کثرتِ مال اور ایک ہے تکاثر فی المال، دونوں میں فرق ہے۔ اگر حلال طریقہ پہ کسی شخص نے مال جمع کیا ہے، اس کی زکوٰۃ نکالتا ہے تو یہ کثرت ہوئی۔ اگر کثرت اپنی حد کے اندر ہے تو اس مال میں کوئی حرج نہیں، یہ حلال و طیب ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ

وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط پاکیزہ روزی ہے اور جائز زینت کو کس نے حرام ٹھیرایا۔ گویا کہ اس آیت میں رہبانیت اور ترکِ دُنیا پر چوٹ لگادی۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، اور نہ یہاں ایسی عیش پرستی ہے کہ ؎ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ کہ انسان آخرت سے بالکل ہی غافل ہو جائے اور دُنیا کا بندہ بن کر رہ جائے، عبداللہ بنا رہ اور عبدالدرہم بن جائے، یہ بھی غلط ہے۔ یہ دو افراط و تفریط کی شکلیں ہیں، اسلام نے اس کے بیچ میں بتادیا۔ اِعْلَمُوْٓا اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۔ یہاں پر مخاطب ہیں وہ لوگ جو دُنیا پرست ہیں، جنھوں نے دُنیا کو، پیسے کو، دولت کو خدا بنالیا اور:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ

اس آیت میں مراد ہیں وہ لوگ جنھوں نے دُنیا کو چھوڑ دیا، تج دیا، اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ کی رضوان اور خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم اس دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں اپنا بسیرا نہ بنالیں۔ تو رہبانیت کا یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ فرمایا کہ:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط

اس آیت کی تفسیر سورۂ کہف سے مزید معلوم ہوتی ہے، فرمایا:

فَقَالَ لِصٰحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۝

یہ بات چیت ہے ایک مومن اور ایک کافر کے درمیان۔ ایک خدا پرست ہے اور ایک دُنیا پرست ہے، مادّہ پرست ہے۔ دونوں کی بات چیت ہو رہی ہے۔ تو جو کافر ہے، مادہ پرست ہے۔ دنیا پرست ہے اور خدا کو نہیں مانتا، خدا پر ایمان نہیں رکھتا، وہ کہتا ہے: فَقَالَ لِصٰحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ۔ وہ اس سے بات کر رہا ہے۔ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا۔ مَیں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں۔ وَ اَعَزُّ نَفَرًا۔ اور میرا جتھا بھی مضبوط ہے، میرا جتھا بڑا قوی ہے، میرے پاس غدمے زیادہ ہیں۔ یہ مطلب ہے وَ اَعَزُّ نَفَرًا ط کا۔

اور اسی طرح جہاں قارون کا ذکر آتا ہے وہاں یہ آیت ہے، فرمایا: اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ط

یہاں پر "اَکْثَرُ جَمْعًا" آیا ہے۔ اس کی جماعت، اُس کا گروہ۔

اسی طرح سورۂ روم میں آتا ہے، وہاں بھی فرمایا:

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا۔

یہاں بڑی بڑی عمارتوں کا ذکر ہے، کس طرح دُنیا پرست اُن پر فخر کرتے ہیں، اور مَیں نے ہندوستان میں دیکھا ہے، یہاں کی خبر نہیں، یہاں بھی ہوتا ہوگا۔ یہ کہ وہ راجپوتوں کی مسجد ہے۔ اُس کے مینار بڑے ہیں، لمبے ہیں اور اُونچے ہیں۔ دوسرے کہیں گے کہ ہماری مسجد بڑی شاندار بنی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ کہیں گے کہ ہماری مسجد شاندار ہے، ہمارے مینار زیادہ ہیں، زیادہ اُونچے اور شاندار ہیں۔

قرآن مجید نے کیا لطافت استعمال کی ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ خواہ تکاثر فی المال ہو، فی الاولاد ہو، فی الاتباع ہو یعنی فی الاشرار یا فی الانوار۔ کسی چیز میں تکاثر ہو، وہ سارے کا سارا تکاثر لغیر اللہ ہے۔ اللہ کے لئے نہیں ہے۔ اگر اللہ کے لئے تکاثر ہوتا تو اسے تکاثر کہتے ہی نہیں ہیں بلکہ اسے مسابقت کہتے ہیں قرآن مجید میں ہے: سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ۔ یہ مسابقت ہے۔ تکاثر میں مذمت کا پہلو ہوتا ہے۔ اُس میں مقابلہ آرائی ہوتی ہے، دوسرے کو نیچا دکھانا اور اپنے آپ کو اونچا سمجھنا: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ۔ فرعون نے اپنے آپ کو اُونچا سمجھا، اپنے آپ کو اُونچا قرار دیا۔ تو یہ عُلوّ پسندی اور خود پسندی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو اونچا سمجھے، اپنے جتھے پر نازاں ہو۔ اولاد زیادہ ہو تو بڑی اچھی نعمت ہے، لیکن اولاد پر فخر کرنا، خواہ وہ خنڈے کیوں نہ ہوں، کہ ہماری اولاد زیادہ ہے۔ اولاد تو ایک نعمت ہے۔ اولاد کے زیادہ ہونے سے کیا ہوتا ہے، جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی تابعدار نہ ہو۔ ایک بات اور یاد رکھئے کہ قرآن مجید میں جو تکاثر سے روکا گیا ہے تو کیوں روکا گیا ہے، اِس لئے کہ تکاثر، تحارب

میں بدل جاتا ہے۔ آپس میں جنگ ہوتی ہے۔ آج ووٹوں کا تکاثر وجود میں آگیا ہے، ووٹ حاصل کرو، چاہے حلال سے چاہے حرام سے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک عورت بیس بیس خاوند بدلتی ہے۔ مختلف طرح کے برقعے اوڑھتی ہے تاکہ جعلی ووٹ بھگتا سکے۔ یہ تکاثر جو ہوا کہ کسی نہ کسی طرح کامیابی ہونی چاہئے۔ نَزْعٌ کے معنی کھینچنے کے آتے ہیں۔ نَزَعَ یَنْزَعُ تنازع کے معنی کھینچا تانی کرنا، کش مکش کرنا بقا کے لئے۔ اسلام تنازع للبقاء کا قائل نہیں، وہ تَوَافُقٌ للبقاء کا حکم دیتا ہے۔ بلکہ قرآنی اصطلاح ہے تعاون للبقاء۔ قرآن میں آتا ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کہ آپس میں تعاون کرو تقویٰ اور برّ کے حصول کے لئے۔ یہ نہیں فرمایا کہ تنازع کرو، بلکہ فرمایا: وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔ یعنی کھینچا تانی مت کرو، نزع برپا نہ کرو۔ تنازع للبقاء کی اصطلاح غلط ہے۔ اصل اصطلاح کیا ہے؟ توافق للبقاء اور قرآن کی زبان میں کیا ہے؟ تعاون للبقاء۔ یعنی باقی رہنے کے لئے آپس میں تعاون کیا جائے تو یہ فرق ہوا تعاون میں اور تنازع میں۔ تنازع اور تحارب پیدا ہوتا ہے کثرتِ تکاثر سے۔ اور رفتہ رفتہ یہی تنازع (کھینچا تانی) طبقاتی نفرت و عداوت میں بدل جاتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تکاثر کا نتیجہ ہے بے قید سرمایہ داری جس کا ردِّ عمل ہے سوشلزم اور کمیونزم۔ اسلام نے اُن دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ بتائی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ یہاں تک کہ جا دیکھیں تم نے قبریں۔ مفسرین نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں

——— ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخری سانس تک تم نے یہ روش اختیار کی کہ مال کی محبت میں اور اُس کے حصول کے لئے مقابلہ آرائی میں ڈوبے رہے یا غنڈوں کی کثرت پہ ناز کرتے رہے، یہاں تک کہ لوگوں نے تمہیں قبر میں ڈال دیا اور آخری سانس تک تمہیں توبہ نصیب نہ ہوئی۔

اور دوسرے معنیٰ یہ بیان کئے گئے ہیں کہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ لوگ آپس میں فخر کرتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ ہم میں کون تعداد میں زیادہ ہے؟: مَنْ اَكْثَرُ مِنَّا جَمْعًا۔ کس کا جتھا بڑا ہے، کس کی پارٹی زیادہ ہے، کس کے ووٹ زیادہ ہیں؟ وہ گنتے تھے اور گنتے گنتے قبرستان پہنچ جاتے تھے کہ ہمارے مرنے والے بھی زیادہ ہیں۔ وہ کہتے کہ قبرستان میں جا کر دیکھو جتھوں قبیلے کے لئے سجان

دی ہے، وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ قبرستان میں قبریں گنی جاتی نہیں کہ یہ ہمارا بیٹا ہے، یہ ہمارا بھائی ہے، یہ ہمارا باپ ہے، یہ ہمارا دادا ہے۔ ہماری قبریں پچاس ہیں تمھاری بیس ہیں تو لہٰذا ہم جیت گئے۔ آئندہ ممکن ہے الیکشن والوں کو بھی یہ بات سوجھ جائے اور ایسا ہوا ہو کہ مُردوں کی طرف سے بھی زندوں نے ووٹ ڈالے ہیں۔ تو یہاں فرمایا "حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ!" یہاں تک کہ تم نے جا دیکھیں قبریں۔ تو یہ دونوں مطلب دُرست ہیں۔ آج کا نظامِ جمہوریت کیا ہے، یہی تکاثر فی الاصوات کی ایک شکل جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں ÷ بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ کا مطلب بتا دیا گیا۔ 'خبردار! ابھی تم جان لوگے، اس دُنیا کے تکاثر کا انجام تمھارے سامنے آجائے گا۔ تکاثر کی خصلت نہایت ہی خراب خصلت ہے۔ یہ نہایت خطرناک ہے اور اس کا نتیجہ انتہائی المناک ہے۔ "ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝" پھر ابھی تم دیکھ لوگے۔ وہ وقت زیادہ دُور نہیں ہے۔ جو چیز آنے والی ہے وہ آکر رہے گی۔ ادھر انسان کی آنکھ بند ہوئی اُدھر انجام سامنے آجائے گا: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (جو مرگیا اُس کی قیامت تو آگئی!) دوزخ کا معاملہ تو برزخ ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ فرمایا كَلَّا۔ خبردار! اگر تم جان لو حقیقی علم۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (اور تم ضرور دیکھ لوگے جہنّم کو) خدا بچائے جہنّم سے۔ جہنّم کے بارے میں یہ عین الیقین ہے کہ دُور سے جہنّم کو دیکھ لیں گے، عین الیقین ہو جائے گا اور کفّار اس میں داخل ہوں گے، اُن کے لئے جہنّم کی آگ حق الیقین بن جائے گی۔ جنّت کی نعمتیں جو آپ یہاں سُن رہے ہیں، یہ ایک مومن کے لئے علم الیقین ہے۔ جب دُور سے جا کر دیکھیں گے یا دروازہ سے باہر کھڑے ہو کر اندر کی نعمتیں دیکھیں گے تو یہ عین الیقین ہے۔ جیسا کہ شراب کے بارے میں آتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ لیا تو یہ عین الیقین ہو گیا۔ اور جب آپ عَسَلٍ مُّصَفًّى کی نہر سے اور لبنِ خالص سے استفادہ کرنے لگے (اللہ تعالیٰ سب کو یہ نعمت دے) تو پھر یہ حق الیقین ہو گیا، تو فرمایا: ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ (پھر تم دیکھ لوگے یقین کی آنکھ سے) یہاں تک تو مرض بتا دیا اور انجام بتا دیا۔ انجام اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب علاج بتایا جاتا ہے، علاج کیا ہے؟ علاج یہ عقیدہ ہے: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝ کہ اللہ کی نعمتوں، مال اولاد، مکان، خوراک، چاہے کچھ بھی ہوں

ان نعمتوں کو اگر ہم استعمال کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن ہمیں ان نعمتوں کے بارے میں جواب دینا ہوگا، تو پھر ایسی صورت میں آدمی تکاثر میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے باہر تشریف لائے تو آپؐ کی حالت یہ تھی کہ گھر میں کچھ کھانے پینے کے لئے نہیں تھا، چنانچہ باہر نکل آئے۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی گھر سے نکلے۔ اُن سے پوچھا انہوں نے بھی اپنی کیفیت یہی بیان کی۔ حضرت عمرؓ کو بھی دیکھا۔ یہ سب باہر جمع ہوگئے اور سب کی یہی حالت تھی کہ : مَا مَعَنَا اِلَّا الْمَآءُ ۔ پانی شاید گھر میں ہو کھانے کو کچھ نہ تھا، تو ذرا جی بہلانے کے لئے باہر نکل آئے۔ جب یہ حدیث پڑھی تھی تو اندازہ نہیں تھا لیکن مدینہ منوّرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ معہ اپنے ساتھیوں کے قُبا کی طرف تشریف لے گئے ہوں گے، جو مسجد نبویؐ سے جنوب کی جانب ہے۔ اُدھر انگوروں اور کھجوروں کے بہت سے باغات ہیں تو اسی طرف آپؐ تشریف لے گئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جو علاقے ہیں اُدھر باغات نہیں ہیں۔ کوشش کی جارہی ہے لیکن ابھی تک رونق قُبا کی طرف ہے، بلکہ قُبا کے چاروں طرف انگور کی بیلیں بھی ہیں، کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ مدینہ منوّرہ کا انگور بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ یہ تو ہے علم الیقین اور کھالیں گے آپ تو حق الیقین ہو جائے گا۔ رسولِ اکرمؐ، حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ یہ تینوں جاتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ ایک انصاری کا باغ ہے۔ پہلے زمانے میں دستور تھا، شاید اب بھی ہو کہ باغ والا خود باغ کے اندر مع اپنے بیوی بچوں کے رہائش اختیار کرلیتا تھا۔ باغ کی نگہبانی بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ رہائش بھی ہے۔ تو آپؐ نے باہر سے آواز دی اُن انصاری کا نام لے کر کہ وہ اندر ہیں یا نہیں ؟ (اُن کی بیوی نے دُور سے دیکھا خوشی سے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ آج تو بن بلائے آفتاب، مہتاب چمک گئے۔ ہماری کتنی خوش قسمتی ہے، ہماری قسمت جاگ اٹھی) بیوی نے کہا کہ پانی لینے گئے ہیں، ابھی آتے ہیں، آپ تشریف لائیے۔ اتنے میں انصاری بھی آگئے۔ انہوں نے دیکھا تو باغ باغ ہوگئے اور کہا کہ تشریف رکھئے اور تازہ کھجوریں لے آئے۔ وہ غالباً جون یا جولائی کا مہینہ ہوگا۔ کیونکہ ابھی مہینوں میں تازہ کھجوریں آتی ہیں۔ ایک بکری کھڑی ہوئی تھی، اسے ٹٹولا اور چھری پھیرنے والے تھے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دیکھو یہ کہیں بچے والی تو نہیں ہے، دودھ والی تو نہیں ہے ؟ سخت بھوک لگی ہوئی تھی، لیکن اس حالت میں بھی یہ خیال کہ بکری کہیں بچے

والی نہ ہو، گابھن نہ ہو کہ بچے کو نقصان پہنچے گا۔ ٹھنڈا پانی اور تازہ کھجوریں پیش کر کے انصاری بہت خوش تھے کہ آج انہیں اتنا بڑا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ رسولِ اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھیوںؓ کی میزبانی، یہ کوئی معمولی شرف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو کوئی بہت بڑا سرکاری افسر یا بڑا مالدار آدمی آجائے تو لوگ پھولے نہیں سماتے۔

جب کھا پی چکے تو آپؐ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ سے فرمایا کہ: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۝ (اُس دن پوچھے جاؤ گے اِن نعمتوں کے بارے میں) انتہائی بھوک کی حالت میں بظاہر انسان سوچتا ہے کہ ایسی حالت میں کیا سوال ہوگا۔ فرمایا نہیں سوال ہوگا، ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ الحمدللہ کہے اللہ کا شکر ادا کرے۔ تو حقیت میں یہ علاج ہے تکاثر کا۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں سب سے بڑی بیماری تکاثر کی بیماری ہے۔ خاص کر مال کی محبت جو دلوں کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔ جس نے لوگوں سے اُن کے اصل مقصدِ زندگی کو ختم کر دیا ہے، وہ اسے چھوڑ بیٹھے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ، تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الْقَطِیْفَةِ۔ (ہلاک ہو دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ)۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے، مشہور ترمذی کی روایت ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن پانچ باتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ جب تک پانچ سوالوں کا جواب نہیں دے دے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قدم نہیں اُٹھ سکیں گے۔ اس میں پہلا سوال ہے: عَنْ شَبَابِهٖ فِیْمَا اَبْلَاهُ جوانی کے بارے میں کہ اُس کی بہاریں کہاں کھپائیں۔ لیکن جوان بننا اور بات ہے، جوان ہونا اور بات ہے۔ جو جوان بنتے ہیں وہ تکلف سے بنتے ہیں۔ بوڑھے ہونے کے بعد بھی وہ جوان بننا چاہتے ہیں، یہ تکاثر میں آجائے گا۔ جوانی ایک نعمت ہے اور واقعی ایک نعمت ہے۔ تو اس کے بعد فرمایا: وَعَنْ عُمُرِهٖ فِیْمَا اَفْنَاهُ۔ عمر کے بارے میں سوال ہوگا کہ عمر کہاں کھپائی، زندگی کے لمحات کہاں صرف ہوئے۔ جوانی بھی عمر میں داخل ہے لیکن جوانی کو خاص طور پر الگ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ جوانی میں انسان وہ کام کر سکتا ہے جو کہ بڑھاپے میں نہیں ہو سکتے، اور جوانوں پر شیطان زیادہ حملہ کرتا ہے۔ تو اس لئے جوانی کے جو غلط تقاضے ہیں، ابلیس کے جو غلط مطالبات ہیں، اُن سے کتراتے ہوئے کوئی شخص اگر اللہ کی راہ پر چلتا ہے تو یہ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، اس

کے رب کا اس پر بہت بڑا فضل و کرم ہے۔ تو فرمایا کہ عمر کے لمحات کہاں بسر کئے، اچھے دوستوں میں گذارے یا بُرے دوستوں میں گذارے؟ اچھی مجالس میں گذارے یا بُری مجالس میں۔ اچھے معاملات میں گذارے یا بُرے معاملات میں۔ سوال ہوگا کہ کہاں گذارے؟ اور مال کے بارے میں دو سوال ہوں گے۔ آج کل کہتے ہیں اقتصادیات بڑی اہم چیز ہے اور یہ دَور اقتصادیات کا دور ہے۔ تو اس سلسلہ میں حدیث میں دو سوال ہیں: عَنْ مَّالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ۔ کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اگر کمایا بھی حلال ذرائع سے اور خرچ بھی حلال کاموں میں کیا۔ تو اگر ایسا ہو تو تکاثر کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور آخر میں فرمایا: وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ۔ اور جاننے کے بعد کیا عمل کیا اور کہاں تک عمل کیا؟ دین کا جو فہم حاصل ہوا ہے، اُس پر عمل کہاں تک ہوا؟ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو جاننے کی کوشش ہی نہیں کریں گے، کیونکہ یہاں پر ہے: وماذا عمل فیما علم۔ تو ہم یہ جانتے ہی نہیں۔ ہم اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ تاکہ خدا کے ہاں کوئی سوال ہی نہ ہو۔ تو یہ خیال بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ جب آپ اس دنیا میں رہتے ہیں، مثلاً آپ کار چلاتے ہیں اور بجائے بائیں کے دائیں طرف آپ اُسے چلانے لگیں۔ ایسے میں حادثہ پیش آجائے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جی ہمیں تو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ کار بائیں جانب چلانی چاہئے۔ وہاں تو یہ سوال ہوگا کہ آپ جب کار چلا رہے ہیں، تو آپ کو کار چلانے کے قواعد پہلے سے معلوم کر لینے چاہئیں کہ ٹریفک کی آمد و رفت کے کیا قواعد ہیں۔ یہ آپ کو پہلے سے معلوم ہونے چاہئیں۔ لہٰذا آپ کی لاعلمی عذر نہیں بن سکتی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی زمین پر آپ چل پھر رہے ہیں، اُس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے آپ کا بسیرا ہے۔ اور اُس کی دی ہوئی چیزوں کو آپ کھاتے پیتے ہیں۔ پھر پھر آپ یہ کہیں کہ ہمیں تو خبر نہیں تھی کہ کیسے کھائیں، کیسے چلیں، کیسے پھریں، کیسے رہیں، زندگی کیسے گذاریں؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی لاعلمی خود ایک جرم ہے۔ تو لاعلم رہنا بھی جرم اور علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کرنا یہ دوہرا جرم۔ اسی لئے پانچواں سوال یہ ہے: وماذا عمل فیما علم۔ یہ پانچ سوال ہیں۔ یہ ہے سورۂ تکاثر کی مختصر تشریح۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(قسط سوم)

حیاتِ طیّبہ کا مکّی دور

سلسلہ تقاریر سیرت النبیؐ

اسرار احمد

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا كَثِیْرًا ؕ ـــــ اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنَا رُشْدَنَا وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ۔ اٰمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

آپ کو معلوم ہے کہ سیرت و تاریخ کے موضوع پر سلسلۂ تقاریر کی آج یہ تیسری کڑی ہے۔ پچھلے دو دنوں میں ہم نے منصبِ رسالت اور اُس کا اصل مقصد اور تکمیلِ رسالت اور اُس کا امتیازی مقام ان دو موضوعات پر گفتگو کی۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ نبوّت و رسالت کا اصل مقصد خلقِ خدا کی ہدایت و رہنمائی کے ساتھ ساتھ محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں اتمامِ حُجّت ہے۔ اس کو قطع عذر کے لفظ سے تعبیر کر لیں یا اتمامِ حُجّت کے لفظ سے: لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔ چنانچہ عدالتِ اُخروی میں جب قوموں اور اُمّتوں کا محاسبہ ہوگا تو اُن کی طرف جن رسولوں کو بھیجا گیا ہے، سب سے پہلے وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت و رہنمائی اور تیرا پیغام جو ہم تک پہنچا تھا، ہم نے بلاکم و کاست اُن تک پہنچا دیا قولاً بھی اور عملاً بھی۔ یہی وہ گواہی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں رسولوں کے لئے یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ وہ شاہد ہوں گے، شہید ہوں گے: اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت ختم بھی ہوئی اور نبوّت و رسالت اتمام اور تکمیل کو بھی پہنچے۔ اس

اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کے دو مظہر بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ نوعِ انسانی شعوری اعتبار سے اور عقلی اعتبار سے عہدِ طفولیت سے نکل کر اپنے بلوغ کو پہنچ گئی اور گویا اس قابل ہو گئی کہ ابدی ہدایت نامہ، مکمّل ہدایت نامہ اس کو دے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس دور کا آغاز ہو رہا تھا کہ جس میں اصل اہمیّت نظامِ اجتماعی کو حاصل ہو لہٰذا ہدایتِ خداوندی اب صرف انفرادی اخلاق و کردار کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک مکمّل اجتماعی نظامِ زندگی کی صورت میں سامنے آئے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے انصاف کیا گیا ہو۔ کوئی قدر بھی اس میں پامال اور مجروح نہ ہو۔ مساوات، آزادی و حُرّیت کی COST پر نہ ہو اور حُرّیت و آزادی کا یہ نتیجہ نہ نکلے کہ نوعِ انسانی HAVES اور HAVENOTS میں تقسیم ہو کر رہ جائے۔ کسی جگہ تو ارتکازِ دولت ہو جائے اور کوئی اپنی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو جائے۔ ایک ایسا متوازن نظامِ عدل و قسط اب نوعِ انسانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہی دو چیزیں دے کر بھیجا گیا۔ ایک الھدیٰ قرآن مجید — ابدی ہدایت نامہ، اور دوسرے دینِ حق۔ مکمّل نظامِ زندگی — اور آپ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ ایک طرف تو قرآن کی تبلیغ کا حق ادا کر دیں: یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ اور دوسری طرف دینِ حق کو، نظامِ عدلِ اجتماعی کو، نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیں تاکہ نوعِ انسانی کے سامنے اس کا ایک نمونہ بھی آ جائے۔ وہ صرف نظری سطح پر پیش نہ کیا جائے، بلکہ اس کو قائم کر کے، چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ گویا کہ اس دور میں اصل اتمامِ محبّت ہے جس کے ضمن میں حضورؐ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا: لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ اور اس کے بارے میں کل میں نے جو آخری بات عرض کی تھی اور جس پر کل کی گفتگو ختم ہوئی تھی، یہ تھی کہ اس پہلو سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ جدّ و جُہد ایک مکمّل انقلابی جدّ و جہد ہے۔ اس میں دعوت بھی ہے، تبلیغ بھی ہے، تربیت بھی ہے، تزکیہ بھی ہے، تعمیرِ اخلاق بھی ہے، تطہیرِ فکر بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن اس ۲۳ سالہ جدّ و جُہد کو اگر آپ اپنے سامنے رکھیں تو اس میں ایک مکمّل

انقلابی جدّ و جُہد کا نقشہ ملتا ہے۔

کل مَیں نے مغربی مفکّرین میں سے دو کا ذکر کیا تھا۔ اپنے اس سلسلۂ تقاریر میں مجھے آگے چل کر ایک اور موضوع پر گفتگو کرنی ہے کہ دَورِ حاضر میں ایک احیائی عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ الحمدللہ! ایک بیداری ہے، ایک حرکت ہے عُروج کی طرف۔ ابھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو کامیابی تک پہنچنے کے مراحل میں کتنا وقت درکار ہوگا۔ لیکن مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک UP-WARD MOVE-MENT شروع ہو چکی ہے۔ وہ جو مولانا حالی نے کہا تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ❊ اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد ❊ دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

وہ بات اب نہیں ہے۔ دریا اب مدّ کی طرف آ رہا ہے، اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس دَور میں اب مسلمانوں کو، اسلامی ثقافت کو، ان تمام چیزوں کو سمجھنے کی واقعتہً سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے۔ اب تک یورپ نے مسلمانوں کو یا اسلام کو سرے سے کوئی اہمیّت دی ہی نہیں تھی، لا یعتدّبہ استہزاء ہوتا تھا، تمسخر ہوتا تھا، کبھی SERIOUSLY مسلمانوں کو لیا ہی نہیں گیا۔ لیکن اب وہ بات نہیں ہے، اس کے اسباب بہت سے ہیں۔ مثلاً ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ امر بھی بہت بڑا ہے کہ اس میں رُوئے ارضی کا جتنا سرمایہ ہے وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں مرتکز ہو گیا ہے۔ اس حد تک کہ واقعہ یہ ہے کہ عربوں کا سرمایہ جو مغربی ممالک کے بینکوں میں ہے، اُس کا اِدھر سے اُدھر ہونا بڑی بڑی حکومتوں اور بڑی بڑی مملکتوں اور سلطنتوں کی معیشت تہ و بالا کر سکتا ہے۔ بہرحال اس کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اب نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت بھی ایک CONTEXT میں سمجھی جائے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک کتاب امریکہ میں شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے THE HUNDRED (سو بڑے انسان نسلِ انسانی کے، کل تاریخ انسانی کی عظیم ترین سو شخصیتیں) اور مصنّف ہیں کوئی مسٹر ہارٹ۔ اور آپ میں سے اکثر نے دیکھا ہوگا کہ NEWS WEEK یا TIMES میں اس پر پورے ایک صفحے کا

تبصرہ ہے، تو ان سو بڑے انسانوں میں سے، اِس مصنّف نے سرِفہرست رکھا ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو۔ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ نسلِ انسانی کی عظیم ترین شخصیت ہیں محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور وہ شخص خود تو اپنی جگہ پر کوئی سند نہیں ہے لیکن جو بات اس نے کہی ہے وہ اُس کی ذہانت و فطانت کی غمّازی کرتی ہے۔ اُس نے یہ مانا ہے اور اپنے اس انتخاب کی دلیل دی ہے اُن لوگوں کے ہاں زندگی کے دو دائرے ہیں — مذہبی دائرہ اور سیکولر دائرہ — سیاست و مملکت، تہذیب و تمدّن یہ اور ہے مذہب اور ہے، تو اُس نے یہ کہا ہے کہ نسلِ انسانی کی واحد شخصیت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں جو زندگی کے دونوں دائروں میں مساوی طور پر کامیاب ہیں:

EQUALLY SUCCESSFUL IN BOTH THE RELIGIO-
-US AND SECULAR SEPHERES OF LIFE.

یہ وہ بات ہے جس کی وجہ سے مَیں چاہتا ہوں کہ اس انقلابی جِدّوجُہد کا ایک اجمالی نقشہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں، تو اس کے لئے یہ بات ایک جامع عنوان بن گئی ہے۔

جب انقلاب کی بات ہوئی ہے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ انقلابی جِدّوجُہد کو سمجھنے سے قبل انقلاباتِ عالم میں انقلابِ محمّدیؐ کا جو مقام ہے اُس پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا برپا کیا ہوا انقلاب دو اعتبارات سے دُنیا کے بڑے بڑے انقلابات سے انتہائی ممیّز ہے۔ بلکہ ان کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں، ایک تو جامعیّت کے پہلو سے جتنے بڑے بڑے انقلابات کا شہرہ ہے وہ جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں صرف ہیئتِ حاکمہ حکومت کا طرز یا نقشہ بدلا ہے، اخلاق نہیں بدلے، نظریات نہیں بدلے، کردار نہیں بدلا، تہذیب و تمدّن اور معاشرت کا نقشہ نہیں بدلا، مذہب نہیں بدلا، عقائد نہیں بدلے، صرف ایک انتظامی ڈھانچہ بدلا ہے۔ طرزِ حکومت کا انقلاب یا اس کی تبدیلی بالکل جزوی انقلاب ہے۔ اسی طرح بالشویک لیوولیوشن اپنے اثرات کے اعتبار سے، اپنی وسعت کے اعتبار سے واقعہ یہی ہے کہ سب سے بڑا وہی انقلاب ہے، انقلابات کی جان ہے۔ کتنا بڑا فتنہ ہے روئے ارضی

کا جس پہ اب وہ نظام بالفعل قائم ہے۔ انقلابات کی ایک زنجیر، ایک چین (CHAIN) ہے ریوولیوشنز کی جن کا اس سے آغاز ہوا۔ لیکن یہاں بھی تجزیہ کیجئے تو ثابت ہوگا کہ وہ بھی جزوی ہے۔ نظریات میں بنیادی طور پہ کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی مادّہ پرستی (METERIALISM) تھا، جس نے ایک قدم آگے بڑھاکر DIALECTICAL METERIALISM کی شکل اختیار کر لی ہے — جدلی مادّیت، مادّیت کا اگلا قدم ہے۔ انقلاب کہتے ہیں تبدیلی کو، یہاں تبدیلی کوئی نہیں۔ مادّیت کی جگہ روحانیت کا آغاز ہو تو وہ انقلاب ہوگا۔ مادّیت ہی کے راستے پر آپ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تو اس میں انقلاب کا کوئی پہلو نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کیا چیز بدلی؟ اس کو چھوڑ دیئے کہ اس کے FOR AND AGAINST کیا نکات ہیں۔ بہرحال ایک کوشش یہ کی گئی ہے کہ کسی ملک کے وسائل پیداوار اور ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لاکر ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے رہنے والے سب کے سب اس سے متمتع ہوں۔ مقصد کی حد تک یہ بات بُری نہیں۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ اس مقصد میں کتنی کامیابی ہوئی اور جو ہوئی وہ کس COST پر ہوئی، اس کو چھوڑیئے۔ میری اس وقت کی گفتگو کا PURPOSE صرف یہ ہے کہ وہ بھی ایک جُزوی انقلاب تھا۔ اب اس پس منظر میں دیکھئے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انقلاب کو:

مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ یہاں آپ کو یہ ڈھونڈنا پڑے گا کہ کیا چیز نہیں بدلی عقائد بدلے، اخلاق بدلے، انفرادی زندگی بدلی، ہئیتِ اجتماعیہ کا نقشہ بدلا۔ ایک قوم جس میں لکھے پڑھے لوگ گنتی کے تھے وہ قوم علوم وفنون کی موجد بن گئی، نوعِ انسانی کی معلّم بن گئی۔ وہ قوم جس میں کوئی تنظیم نہ تھی، ایسی منظّم ہوئی کہ میدانِ جنگ میں اُس کی جو تنظیم تھی وہ تو تھی ہی، وہ عبادت بھی کر رہی ہے تو ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر، جس کا نقشہ دیکھ کر نہ جانے دوسرے لوگوں پر کتنا گہرا اثر ہو۔ ہم تو صبح وشام دیکھتے ہیں لہٰذا ہم پر اُس کی جو نفسیاتی کیفیات ہیں وہ وارد نہیں ہوتیں۔ لیکن اگر کوئی نووارد دیکھے تو یہی چیز اُس کے قلب پر انتہائی گہرا اثر پیدا کرتی ہے۔ زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا، کوئی چیز نہیں جسے آپ کہہ سکیں

کہ وہی رہ گئی کہ جو پہلے تھی۔ یہ ہے ہمہ گیر انقلاب، پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی PARALELL نہیں، اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ؛

ایک دوسری خصوصیت میں بھی اس انقلاب کی پوری انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ انقلابات واقع ہوتے ہیں تو انقلاب کا فکر دینے والا کوئی اور ہوتا ہے اور اس انقلاب کو برپا کرنے والے کچھ اور لوگ ہوتے ہیں۔ انسانوں میں یہ جامعیت بالعموم نہیں پائی جاتی۔ جس شخص کی فکر اور سوچ کی قوتیں زیادہ DEVELOPED ہوتی ہیں۔ اس میں قوتِ عمل کم ہوتی ہے۔ جس کے قوائے عملی زیادہ چاق و چوبند ہوتے ہیں، عام طور پر اس کی سوچ کی قوتیں اتنی بیدار نہیں ہوتیں۔ مفکر اور ہوگا اور عملی رہنما کوئی اور بنے گا۔ فکر دیا VOLTEER اور RUSO نے اور دوسرے بے شمار لوگوں نے، لیکن انقلابِ فرانس آیا کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں۔ ان مفکرین کا اس کی رہنمائی میں ایک پیسہ برابر بھی دخل نہیں۔ فکر دیا MARX نے اور اس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کا سوال پیدا نہیں ہوا یہ تو تیسرے تیواڑے ایک بالکل دوسرے ملک میں ایک فعّال شخص کے ہاتھ میں وہ فلسفہ آیا اور اس نے اس کی بنیاد پر انقلاب برپا کر دیا ؛

اس CONTEXT میں، اس پس منظر میں دیکھئے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل ۲۳ میں اور وہ بھی قمری حساب سے، ہمارے حساب سے وہ ۲۲ بنیں گے۔ انقلاب آگیا، فردِ واحد سے دعوت شروع ہو رہی ہے اور کل ۲۲ برس میں۔ ایک LIFE SPAN ہے اور حضورؐ کی تو یہ دنیوی زندگی بڑی مختصر رہی ہے، ۶۱ برس۔ یہاں آپ کو پھر مغالطہ ہے ۶۳ برس کا۔ ۶۳ برس قمری ہیں، اصل عمر ۶۱ برس یا ۶۱½ برس ہے۔ یہ بھی کوئی عمر ہے۔ اس میں سے وہ چالیس سال نکال دیجئے تو کل ساٹھ اکیس، بائیس برس ہیں اور اس میں ایک عظیم انقلاب تمام مراحل طے کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پوری نسلِ انسانی کی تاریخ میں اس کے عشرِ عشیر کی بھی مثال نہیں ملتی۔ آس پاس آنے والی بات تو بڑی اونچی ہے ؛

اب آئیے اس بات کی طرف جو اس انقلابی جدّوجُہد کا اہم ترین پہلو ہے جس کی طرف میں کل اشارہ کر چکا ہوں - یہ پوری جدّوجُہد زمین پر ہوئی ہے - قدم بقدم چل کر ہوئی ہے ، خالص HUMAN LEVEL پر ہوئی ہے - دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قواعد و ضوابط ، اسباب و علل کا جو سلسلہ چل رہا ہے ، ان کے تحت ہوئی ہے اور اس کو یوں سمجھئے کہ یہ بھی درحقیقت اتمام حجت کا ایک پہلو ہے - یہ اتمام حجّت ہے اُمّتِ محمّدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ نظام قائم کر کے دکھا دیا اتمام حجّت ہے پوری نوعِ انسانی پر اور اس کو اس طریقے پر کر کے دکھانا کہ جو ایک عام انسانی جدّوجُہد کی سطح ہے ، تمام موانع و مشکلات کے باوجود کر کے دکھانا - ابتدائی دور میں ناکامیوں کا طرح طرح سے سامنا کر کے دکھانا ، مصائب اور مشکلات کو جھیل کر کے دکھانا ، یہ درحقیقت حجّت ہے مجھ پر اور آپ پر - اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تو یہ کام کر دیا - آپؐ کو تو یہ یہ خصوصیات حاصل تھیں اللہ کی طرف سے ، آپؐ کے تو پاؤں میں کانٹا بھی نہیں چُبھا ، آپؐ کی تو نکسیر تک نہیں پھوٹی ، آپؐ کے لئے تو کہیں کوئی دقت اور مشکل آئی ہی نہیں ، ہمارا معاملہ اور ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ؛ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ہم سے یہ مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی اللہ کے دین کو قائم کریں جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قائم کیا - یہ ہے اتمامِ حجّت اُمّتِ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر -

اب ذرا اس بائیس سالہ انقلابی جدّوجُہد کا ایک سرسری جائزہ (BIRD'S EYE VIEW) لیجئے - ہمارا حال حضورؐ سے دُوری اور بُعد کا ہے عشق کے تمام دعووں کے باوجود اگر آپ SELF ASSESSMENT کریں کہ حضورؐ سے ہمیں کتنا تعلّق ہے تو اس کے لئے ایک بڑا آسان سا پیمانہ یہ ہے کہ ذرا ذہن میں یہ سوچئے کہ اس ۲۳ سالہ یا ۲۲ سالہ جدّوجُہد کے ۲۲ واقعات بھی آپ کو معلوم ہیں ؟ تو معلوم ہوگا کہ بڑا بُعد ہے ، بڑی دُوری ہے -

ذرا چشم تصوّر سے آغازِ کار کو ذہن میں لائیے۔ اللہ کا ایک بندہ جو اپنی ذاتی سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہے، ایک وقت آیا ہے بگ بھگ چالیس برس کی عمر ہوئی ہے، اب تک جو زندگی بسر کی ہے وہ ایک بھرپور انسانی زندگی ہے۔ کہیں کسی خانقاہ میں بسر نہیں کی کہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں نہیں رہے۔ سارے چالیس برس بھرپور زندگی کے ہیں۔ کاروبار کیا ہے، اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار کیا ہے۔ EXPORT IMPORT کا کاروبار ہے۔ شام کو قافلے جا رہے ہیں۔ وہاں سے آ رہے ہیں اور اس میدان میں اپنی امانت اور دیانت کا لوہا منوایا ہے، شادی کی ہے بھرپور عائلی زندگی بسر کی ہے، صاحبِ اولاد ہیں، لیکن یہ چالیس برس کی عمر کے آس پاس وقت آیا ہے تو طبیعت میں یکدم خلوت پسندی کا غلبہ ہو گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: فلما بلغ اربعین سنۃ حُبّب الیہ الخلاء فکان یخلو بغار حرا یتحنّث فیہ۔ خلوت گزینی محبوب ہو گئی۔ غارِ حرا میں کئی کئی دن مراقبہ ہو رہا ہے۔ تحنّث عبادت کو کہتے ہیں، یہ عبادت کیا تھی شارحین کہتے ہیں: "کان عبادتہ التفکر والاعتبار" غور و فکر اور سوچ بچار۔ سورۂ شوریٰ میں نقشہ کھینچا گیا ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ اے نبی! آپ کو معلوم نہ تھا، کتاب کسے کہتے ہیں، آپ تو اُمّی تھے، کسی سابقہ آسمانی کتاب سے آپ کا ربط و تعلق نہیں تھا، کسی آسمانی شریعت سے آپ واقف نہ تھے۔ ایمان اجمالاً تو ہر نبی کو پیدائشی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن تفصیلاً ایمان کیا ہے، یہ بھی آپ کو معلوم نہ تھا ہم نے پردے اٹھائے: وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى۔

وحی کا آغاز ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ

الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔

اس کے بعد متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت گزرا ہے جس میں حضورؐ کی تعلیم ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم کو اس کی تفصیلات نہیں ملتیں ——— بعض دفعہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسرافیل مسلسل حضورؐ کے ساتھ رہے۔ آپؐ کی تعلیم ہوئی ہے تو ہماری سطح کی تعلیم نہیں ہے۔ الف، با، تا والی تعلیم نہیں ہے، تعلیم ہوئی ضرور ہے: عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى اور اس کے بعد وحی آئی۔ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ! اے لحاف میں لپٹ کر سونے لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) اب کمربستہ ہو جاؤ، کھڑے ہو جاؤ، اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دو اور اس کے لئے دو الفاظ ذرا اچھی طرح نوٹ کر لیجئے: قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ کمربستہ ہو جائیے، خبردار کیجئے، آگاہ کیجئے لوگوں کو غفلت کے نتائج سے، خدا سے دُوری کا جو انجام ہونے والا ہے، اس سے خبردار کیجئے۔ آخرت کی منزل جو ہر شخص کے لئے آ کر رہنی ہے، اس سے متنبہ کیجئے: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ اور اپنے رب کو بڑا کیجئے، اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے۔ یہ اس کا لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ تصغیر کے معنی کسی کو چھوٹا کر دینا اور تکبیر کے معنی کسی کو بڑا کر دینا۔ رب کو بڑا کرو، کس معنی میں؟ رب کی بڑائی مانی جائے۔ اپنی جگہ وہ بڑا ہے، لیکن یہاں نہ معلوم کون کون ہیں جو اُس کی بڑائی کو چیلنج کرتے ہیں، ہماری مرضی چلے گی، اُس کی نہیں، ہماری پسند سے معاملہ طے ہوگا ہم نہیں جانتے کہ رب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ حکومت ہماری ہے ہم نہیں جانتے کہ رب کون ہے: "وما ربّ العٰلمین!" جس طرح فرعون نے طنزاً پوچھا تھا۔ یہ کون ہوتے ہیں رب العالمین! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں۔ اس طرح بالفعل تو پوری دُنیا رب العالمین کو بھولے ہوئے ہے یا اُس کا انکار کئے ہوئے ہے اور اپنی خدائی کی دعویدار ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست ❊ لیک اورا عون، ما را عون نیست

اِس صورتِ حال کو بدل کر اپنے رب کو بڑا کیجئے، بڑائی منوائیے۔ حضرت مسیح کا قول ہے جو میں نے آپ کو سنایا تھا کہ: "اے اللہ! تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی

ہے، ویسے ہی زمین پر پوری ہو!"۔ یہ ہے تکبیرِ ربّ۔ بقول علّامہ اقبال مرحومؒ

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ⁂ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدامست ⁂ یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

تکبیرِ ربّ - یہ ہے وہ چیز جس کا ایک بارِ گراں محسوس کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے: خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ (مجھے اپنی جان کا خدشہ ہے!) اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ آپ کو تسلّی دے رہی ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ آپ یتیموں کی سرپرستی فرمانے والے، بیواؤں کی خبر گیری کرنے والے، بھوکوں کو کھانا کھلانے والے اور مسافروں کی خدمت کرنے والے ہیں۔ تقریباً تین برس تک دعوت و تبلیغ ہوئی ہے، اس سطح پر کہ صرف اپنے قریب ترین لوگ ہی اس کے مخاطب رہے ہیں۔ لفظِ 'خفیہ' کا استعمال کرنا تو درست نہیں ہوگا۔ خفیہ بات وہاں کوئی نہیں تھی، البتہ ڈنکے کی چوٹ بھی نہ تھی، علی الاعلان نہیں تھی PERSONAL CONTACT سے، ذاتی تعلّقات کی بنیاد پر، دعوت اندر ہی اندر پھیل رہی تھی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنھا، آپ کی اہلیہ محترمہ، سب سے پہلے ایمان لانے والی تھیں، قریب ترین دوست، جگری دوست حضرت ابوبکر صدّیق ایمان لائے اپنے ہی زیرِ تربیت اور زیرِ کفالت چچا زاد بھائی حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ ایمان لائے۔ اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضؓ ایمان لائے۔ یہ چار افراد ہیں سب سے پہلے ایمان لانے والے۔ اِن چاروں میں اوّلیّت کا معاملہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے اندر بڑی عمدہ مطابقت پیدا کی گئی، کہ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضؓ - آزاد اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضؓ، بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی رضؓ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضؓ۔ یہ چار حضرات ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اوّلیں کمائی۔ ان میں سب سے قیمتی کمائی ہیں حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ۔ معاشرے میں ان کو بلند مقام حاصل تھا۔ ان کی سچائی اور امانت مسلّم تھی۔ ان کی نیکی، خلقِ خدا سے ہمدردی، وسعتِ قلبیہ، ان کی راستبازی سب مسلّم۔ پھر یہ کہ وہ اپنے معاشرے کے متموّل فرد تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت جو ایک قبیلے کی حکومت تھی۔

اس میں ایک انتہائی نازک ذمہ داری ان کے سپرد تھی، اور وہ تھا دیت کا فیصلہ کرنا، خوں بہا کی رقم کا تعین اور قتل کے مقدمات کا فیصلہ کرنا۔ یہ منصب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس تھا، جب وہ ایمان لائے۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے کہ: " اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ وہ ایک فرد نہیں تھے، ایک امت تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ بھی ایک فرد نہ تھے، ایک اُمت تھے۔ چنانچہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ وہ ہیں جو اُن کی دعوت پر ایمان لائے۔ حضرت عثمانؓ کو لاکر حضورؐ کی کی خدمت میں پیش کرنے والے حضرت ابوبکرؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کو لاکر حاضر کرنے والے ابوبکر صدیقؓ۔ سعد بن ابی وقاص، فاتح ایران اور عبدالرحمٰن بن عوف کو لاکر پیش کرنے والے حضرت ابوبکرؓ۔ عشرۂ مبشرہ میں سے یہ وہ چھ چوٹی کے صحابہؓ ہیں جو حضرت کی دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے۔ بات چل رہی تھی ابلاغ وانذار کی۔ حضورؐ کو حکم ہوتا ہے: اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجئے!) یہ ہے وہ بات جو میں نمایاں کرنا چاہتا ہوں — HUMAN LEVEL۔ پر دیکھئے کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ سوچئے! حضرت علیؓ کو حکم دیا دعوتِ طعام کا اہتمام کرو، بنی ہاشم کو بلاؤ، کھانا کھلاؤ، بالکل فطری طریقہ، کھانا کھلایا گیا۔ کھڑے ہو کر وعظ کیا، دعوت پیش کرنا چاہی اُدھم مچ گیا، کسی نے بات نہ سُنی۔ آخر چرچا تو ہو چکا تھا۔ معلوم تو تھا انہیں کہ ہمیں کس لئے جمع کیا گیا ہے، شور مچا دیا گیا، بات ہی نہیں سُنی۔ اوّلیں کوشش ناکام ہو گئی۔

دیکھئے! ذہن میں رکھئے، میری آج کی گفتگو میں ناکامی کا لفظ بار بار آئے گا۔ مغالطہ نہ ہو، نبی کی کوشش ناکام نہیں۔ نبی کے نقشِ قدم پر چلنے والے کسی انسان کی کوئی کوشش ناکام نہیں ہوتی۔ کس پہلو سے؟ کہ اس کا اجر خدا کے ہاں محفوظ ہے، لیکن ایک ہے دنیا میں اس کے نتائج نکلنا۔ کامیابی کا یہ جو تصوّر ہے اس کے اعتبار سے لفظ بول رہا ہوں کہ ناکامی کا سامنا ہوا۔ دوبارہ کوشش کی گئی، پھر کھانا کھلایا۔ ذرا سا موقع مل گیا۔ کھڑے ہو کر دعوت پیش کی۔ پورا مجمع گم سُم، صرف حضرت علیؓ کھڑے ہوئے ہیں جو پہلے سے ہی اپنے تھے۔ حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر کہا، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، اگرچہ مجھے آشوبِ چشم بھی ہے لیکن میں آپ کا ساتھ

دوں گا اور پورا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے کہ چلے ہیں عالمی انقلاب بپا کرنے اور یہ ہیں ان کے ساتھی، کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس طرح دونوں دعوتوں کا نتیجہ ۷ رہے۔

اب ذرا تصوّر کیجئے! قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حکم نازل ہوتا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ۔ کہ اے نبی! ایک قدم آگے بڑھائیے اور جس بات کا آپؐ کو حکم ہوا ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ کہئے۔ اب پھر سوچئے، کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ جن ظروف و احوال میں آپ کو کام کرنا ہے ان میں جو بھی ممکن طریقہ ابلاغ کا آپ کے پاس ہے اسے استعمال کرنا ہے۔ اس دور میں رواج یہ تھا کہ اگر لوگوں کو جمع کر کے کوئی بات سنانی ہوتی، یا کوئی اہم خبر دینی ہوتی تو کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر کوئی شخص نعرہ لگاتا تھا: 'واصباحاہ' اس زمانے میں خبر کیا ہوتی تھی کہ فلاں قبیلہ تم پر حملہ کرنے والا ہے، ہوشیار ہو جاؤ! اپنا بچاؤ کر لو! اور وہاں یہ رواج بھی تھا کہ وہ شخص بلند مقام پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ چیختا تھا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا، مادر زاد برہنہ ہو جاتا تھا تاکہ جس تک آواز نہ پہنچی ہو وہ شخص دیکھے تو سہی کہ کوئی بات ہے جو یہ شخص ننگا ہو کر کھڑا ہو گیا ہے اسے نذیر عُریاں کہتے تھے (ننگا خبردار کرنے والا)۔ اب یہاں دیکھئے اجتہاد و حکمت۔ طریقہ وہی اختیار کیا، لیکن اس میں سے جو چیز حیا کے، شرم کے، عفت کے منافی تھی اس کو نکال دیا، کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا: واصباحاہ۔ ننگے ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ لوگ جمع ہوئے، نہ جانے کیا بات ہے۔ اب دعوت پیش کی 'وہی انذار'، مجمع میں سے ابولہب بولتا ہے: تبًّا لک الھذا اجمعتنا نقلِ کفر، کفر نباشد۔ محمدؐ! تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کیا تو نے ہمیں اس کام کے لئے جمع کیا تھا؟ ہم بڑی مصروفیات میں تھے، مشاغل تھے، ہم سمجھے واقعتاً کوئی بڑی اہم بات ہے۔ یہ ہے وہ مقام جب یہ سورت نازل ہوئی: تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝ ہاتھ ابولہب کے ٹوٹ گئے، لیکن اسے معلوم نہیں۔

نظامِ نو پیدا ہو رہا ہے، عالمِ پیر مر رہا ہے۔ درحقیقت تو ہاتھ کسی کے نہیں ٹوٹے لیکن بہرحال نتیجہ ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ اس وقت تو صورت یہ ہے کہ اس دعوت

عام کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ناکامیوں پر ناکامی۔ یہاں بھی پڑھئے آخری پارے کی اور انتیسویں پارے کی سورتیں۔ کیوں آتا ہے بار بار اے نبی! صبر کیجئے: "فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ" صبر کیجئے، جھیلئے، ہمت جواب نہ دے، مایوسی اور نا امیدی پاس نہ پھٹکنے پائے: "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ"! سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات میں آخری بات صبر ہے: "يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ"۔ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ بہرحال دعوت جاری ہے، ایک بات ذہن میں رکھئے کسی بھی انقلابی دعوت کا معاشرے پر پہلا ردِّ عمل ہوتا ہے، استہزاء و تمسخر کہ چٹکیوں میں اڑاؤ، پاگل ہوگئے ہیں۔ جنون کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔ ذہنی توازن ان کا ٹھیک نہیں رہا۔ کبھی مخلصانہ، دردمندانہ اور خیرخواہانہ انداز میں کہا جاتا ہے: "اچھے بھلے آدمی تھے، کیا ہوگیا بیٹھے بٹھائے!" تسلی کے لئے آیاتِ الٰہیہ اُتر رہی ہیں: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ (اے نبی! آپ ملول نہ ہوں، غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے مجنوں تھوڑا ہی ہوجائیں گے!) فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝ (عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے اور آپ بھی دیکھ لیں گے!) بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ ۝ کہ دماغ کس کا خراب ہوا ہے، بچل کون گیا ہے، یہ ہے وہ ابتدائی دور ــــ دعوت کا سلسلہ جاری ہے۔

اب یہاں دو باتیں اس دور کے متعلق اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ دعوت کا ذریعہ تمام تر قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کی کہیں جا کے کوئی بات پیش کی ہے اور کہیں کوئی آیاتِ قرآنی پڑھ کر سنائی جارہی ہیں۔ معلوم ہوا فلاں جگہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے۔ وہاں پہنچے اور ان سے کہا کہ میرے پاس ایک کلام ہے جو میں پیش کرتا ہوں، کلامِ الٰہی سُنایا۔ تذکیر ہے قرآن کے ذریعے سے: فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ۔ انذار ہو رہا ہے قرآن کے لئے: أُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ (یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعہ سے خبردار کردوں۔ انذر بہ، لتبشر بہ اور ذکر بہ۔ اس کے ذریعے

سے تذکیر کیجئے، اِس کے ذریعے سے تبشیر کیجئے، اس کے ذریعے سے انذار کیجئے۔ دعوت ہو تو اس کی ہو۔ گویا کہ مرکز و محور اس کا قرآن مجید ہو سے

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا ❊ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

دوسری بات یہ کہ چونکہ لفظِ انقلاب بار بار آیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ انقلابی جدّ و جُہد کے بعض مراحل وہ ہیں جو تمام انقلابات میں مشترک ہوتے ہیں۔ دعوت، تنظیم، تربیت، تصادم، ہر انقلاب کے لازمی مراحل ہیں لیکن انقلاب کو انقلاب سے ممیز کرنے والی چیز یہ ہے کہ دعوت کی بنیاد کیا ہے، اور جو جماعت اس دعوت کو قبول کر رہی ہے، اس کی تربیت کا اصول کیا ہے۔ یہاں سے دونوں انقلاب ممیز ہو جائیں گے، راستے جدا ہو جائیں گے۔ ایک صالح انقلاب ہوگا اور ایک فاسد انقلاب ہوگا۔ ایک انقلاب وہ ہے جس کی بنیاد خدائے واحد کی پرستش پر ہے آخرت کے یقین پر اس کی بنیاد ہے، اعمالِ صالحہ اس میں اوّلیں قدم پر ہیں۔ انسانی ہمدردی، سچائی، یہ اس کے اندر PRE-REQUISITES ہیں۔ ابتدائی لوازم ہیں۔ ایک دعوت وہ ہے جس میں کسی قوم کی قومی عصبیت کو ابھارا گیا ہو، جس میں کسی نسل کی نسلی عصبیت کو اپیل کیا گیا ہو، جس میں طبقاتی شعور اجاگر کیا گیا ہو۔ زمین و آسمان کا فرق یہاں سے پڑے گا ورنہ یہ کہ دعوت ــــ یہ لفظ مشترک ہے۔ انہیں بھی دعوت پیش کرنی ہوگی ہمیں بھی اپنی دعوت پیش کرنی ہوگی۔ کوئی سیاسی ہنگامہ کوئی قومی نعرہ، کوئی طبقاتی کش مکش ــــ یہ راستہ اور ہے، اور: قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا ــــ کا راستہ اور ہے۔ آخرت کی تیاری کرو، اس کی جواب دہی کی تیاری کرو۔ اپنے آپ کو رذائل اور ذمائمِ اخلاق سے پاک کرو اور اپنی زندگیوں کو محاسن و مکارمِ اخلاق سے مزیّن کرو۔ یہ بات اور ہے، تو فرق یہاں ہے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ کہیں بار بار لفظِ انقلاب کی تکرار سے آپ اس فرق کو بھول نہ جائیں، نظر انداز نہ کر دیں، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

ایک بات اور ذہن میں رکھیے، مذہبی تبلیغ جو دنیا میں ہوتی ہے عام طور پر وہ سوسائٹی کے پست طبقات میں ہوتی ہے۔ اُن کی مظلومیت سے ذرا سا ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر اُن کے سامنے آئیے، اور اُن کے نام بدلوا لیجئے۔ کوئی سابقہ لاحقہ نام

ہیں لگا اور انہوں نے رجسٹر میں درج کر لیا کہ ہم نے اتنے عیسائی بنائے ہیں۔ جو برکت علی تھا وہ برکت مسیح بن گیا۔ انقلابی دعوت ہمیشہ معاشرے کے اونچے طبقے اور ذہین ترین عنصر سے خطاب کرتی ہے۔ وہ اپنی دعوت کو عقلی بنیاد پر پیش کرتی ہے ظاہر ہے کہ ایک نظریہ اور ایک فلسفہ کو قبول کرنے والے معاشرے کے اُونچے طبقے کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے جن لوگوں کے نام ابھی مَیں نے گنوائے ہیں، یہ اُس سوسائٹی کا مکھن تھے۔ ابوبکر صدیق، عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہؓ، زُبیر اور سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم ——— یہ ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے۔ اگرچہ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں اور طبقات کے لوگ بھی پیش قدمی کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین طبقات میں سے تو جو بالکل صالح طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں، وہ آئیں گے، اس لئے کہ اُن کے پاؤں میں مفادات کی بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، وہ قائل تو ہو جاتے ہیں کہ بات درست ہے، لیکن اپنی چوہدراہٹ، اپنے VESTED INTEREST، اپنے رتبہ، اپنے مقام و مرتبہ، اپنی وجاہت کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بہت ہی صالح مزاج اور سلیم الفطرت لوگ ہوتے ہیں جو چھٹ کر آجاتے ہیں اور یہ ہوتے ہیں سوسائٹی کا مکھن ———!

اس کے بعد دو طبقات اور ہیں، ایک نوخواندہ کا طبقہ کہ جس میں ابھی وہ مصلحت کوشی اور مصلحت بینی نہیں ہوتی جو پہلے طبقے کے لوگوں پر مسلط ہوتی ہے اِن میں ولولہ ہوتا ہے۔ بات قبول کی اور اُس پر "ہر چہ بادا باد" کہہ کر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اور دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو دبا ہوتا ہے، پسا ہوتا ہے، اُس پر کوئی بندھن نہیں ہوتے، اُس کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں ہوتی ——— وہ دعوتِ حق کو اس کی FACE VALUE پر قبول کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہی تین طبقات ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں پیشقدمی کی۔ یا تو چوٹی کا طبقہ ہے جن کے مَیں نے نام گنوائے ہیں، لیکن یہ چند ہیں اگرچہ ان میں سے ایک ایک جو ہے، وہ ایک ایک لاکھ کے برابر ہے، یا پھر بالکل نوجوان ہیں، اور یا پھر وہ طبقہ جو انتہائی دبا ہوا، پسا ہوا، مظلوم و مقہور ہے جس کا کوئی حق اس

معاشرہ میں نہیں تھا یعنی غلاموں کا طبقہ۔ بلالؓ ایمان لائے، ابو وکیع ایمان لائے خبابؓ ابن اَرَت ایمان لائے، لونڈیاں ایمان لائیں، آلِ یاسر ایمان لائے اور اسی سے سمجھ لیجئے کہ اس فاسد نظام کی اب RETALIATION شروع ہوئی ہے، یعنی اس کا ردِّ عمل۔ جب وہ نظام یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے استہزاء اور تمسخر، اور چٹکیوں میں اُڑانے سے وہ بات ختم نہیں ہوئی۔ یہ دعوت تو پیشقدمی کر رہی ہے، آگے بڑھ رہی ہے تو ہمیشہ دوسرا جو حربہ ہوتا ہے وہ تشدّد (PERSECUTION) کا ہوتا ہے۔ یعنی کہ انہیں مارو، انہیں ستاؤ، اور ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں سب سے زیادہ پسنے والے یا غلام ہوتے ہیں یا نوجوان۔ وہی خبابؓ ابن اَرَت ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہ دہکتے انگارے زمین پر بچھا دیئے گئے اور ننگی پیٹھ اُن کو لٹا دیا گیا کہ باز آؤ! وہی بلالِ حبشی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہ تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر لٹا کر اور سینے کے اُوپر بھی ایک بھاری پتھر رکھ دیا گیا — سورج، مکّے کا سورج نصف النّہار پر — یا کبھی گلے میں رسّی ڈال دی گئی ہے اور اوباش نوجوانوں کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا ان کو اوندھے مُنہ گھسیٹو اور ان کی زبان سے نکل رہا ہے اَحَد، اَحَد، اَحَد۔ کبھی ابوجہل برچھا لئے کھڑا ہے اور حضرت سُمَیّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مار دیتا ہے۔ اس طرح وہ راہِ حق کی پہلی شہید ٹھہرتی ہیں، اُن کا خون راہِ حق میں بہنے والا سب سے پہلا خون ہے۔ حضرت عمّار کے والد — حضرت یاسرؓ ہیں۔ چار مضبوط سانڈ جوان اُونٹ لے کر ان کے ساتھ رسّے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ رسّوں کے دوسرے سروں کے ساتھ اُن کے دونوں بازو اور ٹانگیں کس دی جاتی ہیں اور پھر اُن اونٹوں کو ایک دم مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا اور اس طرح ان کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔ یہ ہے بہیمانہ تشدّد جو روا رکھا گیا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قلب مبارک پر کیا بیتتی ہوگی۔ وہ پیغامِ ربّانی جو آپ کو ملتا تھا: فَاصْبِرْ وہی آپ اپنے جاں نثاروں اور ساتھیوں میں بانٹتے گئے: اصبروا یا آل یاسر اصبروا یا آل یاسر! سامنے سے گزر رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ ابوجہل کیا کر رہا ہے، ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ اور کہتے ہیں تو صرف یہ کہ اے یاسر کے گھر والو!

صبر کرو اور جھیلو - فان موعدکم الجنّۃ - اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تم سے جنّت کا ہے - پھر یہ نہیں کہ یہ جو اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں، ان میں سے بالخصوص نوجوانوں پر تشدّد ہوا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نوجوان ہیں انہیں اُن کے چچا نے ایک چٹائی میں لپیٹا اور دُھواں دے دیا - ایک اور نوجوان ہیں ان کو بالکل مادر زاد ننگا کر کے گھر سے نکال دیا گیا کہ تم نے اگر اپنے آبائی دین کو چھوڑا ہے تو ماں باپ کی کسی چیز پر تمھارا کوئی حق نہیں ہے - انہوں نے سب کچھ تج دیا کہ ٹھیک ہے میں سب کچھ چھوڑتا ہوں - آخری بات کہی گئی کہ یہ کپڑے بھی اُنہی کے ہیں، انہیں بھی اُتار دو، اور برہنہ جا کر ماں کے سامنے جا کھڑے ہوئے - ماں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے تو کہا کہ ماں! میں مُوحّد ہو گیا ہوں، یہ اُس کی سزا ہے، جو مجھے مل رہی ہے، یہ ہو رہا ہے - حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مارا گیا، اور بالکل مُردہ سمجھ کر چھوڑا گیا - کہاں اُن کا STATUS اور کہاں اُن کا یہ حال حضورؐ نماز پڑھ رہے ہیں خانہ کعبہ میں، ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط سے کہتا ہے کہ ذرا جاؤ اُن کی خبر لو اور وہ چادر کو بل دے کر گردن میں پھندا بنا کر ڈالتا ہے اور پھر جو اس کو بل دیتا ہے تو آپؐ کی آنکھیں اُبل پڑیں -

اسی طرح ایک مرتبہ آپ سجدے میں پڑے ہیں، وہی عقبہ بن ابی معیط ابوجہل کے کہنے پر جاتا ہے کہ فلاں محلّے میں اُونٹ ذبح ہوا ہے اُس کی اوجھڑی پڑی ہوئی ہے، وہ لا کر اُن کے کاندھے پر رکھ دو، وہ رکھ دی گئی جس کے بوجھ کی وجہ سے آپ سر نہ اٹھا پائے - یہ بہیمانہ تشدّد اپنے نقطۂ عُروج کو پہنچ گیا ۵ھ میں - یہ پانچ نبوی ہے، آغازِ وحی کے بعد سے ہجری نہیں - ہجرت کی اجازت آئی - ہجرت حبشہ ۵ھ میں ہوئی، دو قافلے نکلے، پہلے قافلے میں بارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں - جن میں حضرت عثمانؓ بھی تھے اور اُن کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہؓ جو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لختِ جگر تھیں، بھی ہمراہ تھیں - حضورؐ نے فرمایا حضرت لوط علیہ السّلام اور اُن کی بیوی کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو راہِ خدا میں ہجرت کر رہا ہے، دوسرا قافلہ جو ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں پر مشتمل تھا، حضرت جعفر طیّار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوا - اتنے ہی لوگ ہوں گے جو مکّے میں رہ گئے ہوں گے

یا اس سے کم وبیش۔ تو یہ تھی کمائی پانچ برس کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لیکن دعوت کا قدم پیچھے نہیں ہٹ رہا اور یہ دعوت تھی قرآن کی اور اس کی تعلیم کی۔ "یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ" ۔ ۲ میں کچھ پانسا پلٹتا ہے۔ حضرت عمر ایمان لے آئے، حضرت حمزہ ایمان لے آئے رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ کچھ مسلمانوں کو بھی حوصلہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے میں حضرت خباب ابن ارت، جن کا ذکر ابھی گزرا، بڑا دخل ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب کے گھر پہ گئے ہیں اور دستک دی ہے تو یہ خباب ابن ارت اُن کو اور اُن کے شوہر حضرت سعید بن زید قرآن پڑھا رہے تھے۔ اُن سے قرآن مجید لے کر حضرت عمرؓ پڑھتے جاتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں تا آنکہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ گویا اس وقت دعوت کا مرکز و محور قرآن ہی تھا۔ میں اس سے پہلے کی دونوں تقریروں میں بتا چکا ہوں کہ اصل منہاجِ انقلاب کیا ہے۔ اب اگرچہ میں نے امکانی حد تک کوشش کی ہے مگر بہت سے نکات رہ گئے ہیں۔ سب کا احاطہ ممکن نہیں۔

اِن تقریروں میں کچھ چیزوں کی وضاحت قدرے ضرورت سے زائد بھی کرنی پڑ جاتی ہے، اس لئے کہ ؎ "بزم میں تو اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی!" کچھ بات کو اور زیادہ واضح کر کے بیان کرنا پڑتا ہے۔ تحریر میں جامعیت ہو سکتی ہے "نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقصدِ بعثت!" کے عنوان سے میرا ایک کتابچہ موجود ہے جس میں یہ تین نکات میں نے اپنی امکانی حد تک واضح کئے ہیں۔ نبوّت کا بنیادی مقصد کیا ہے، ختمِ نبوّت کے لوازم کیا ہیں، آنحضورؐ کے انقلاب کا بنیادی طریقِ کار کیا ہے۔ اِس کتابچہ کا ضرور مطالعہ کیجئے اور چونکہ ان تین دنوں میں یہ باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس وقت وہ پڑھیں گے تو وہ آسانی سے سمجھ میں آئے گا، اِس لئے کہ میری تحریر کے بارے میں یہ شکوہ عام ہے کہ وہ ذرا ثقیل ہوتی ہے، اس وقت اگر پڑھیں گے تو اِن شاء اللہ اس کے سمجھنے میں بہت آسانی ہو گی۔ بہرحال ایک طرف تو یہ حضرت عمرؓ اور حضرتِ حمزہؓ کا ایمان مسلمانوں کے لئے موجبِ تقویّت ہوا، دوسری طرف سردارانِ قریش بھی چونکے کہ یہ مشتِ خاک تو ایک بہت بڑا طوفان بن گیا ہے

لہٰذا یہ وہ وقت ہے کہ جب ایک طرح کا الٹی میٹم حضرت ابو طالب کو دے دیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ ابو طالب کے ساتھ یہ کوئی خاص معاملہ نہیں ہوا۔ وہ قبائلی نظام تھا۔ ان کے ہاں شرافت کی بنیاد یہ تھی کہ اپنے قبیلے کے فرد کا ساتھ نہیں چھوڑنا اور ابو طالب نے بہرحال اس شرافت کا ثبوت دیا، اس سے انکار نہیں۔ بنی ہاشم کی سیادت اب ابو طالب کے پاس تھی اور قریش حضورؐ پر کوئی وار کرنے سے اس لئے ڈرتے تھے کہ یہ قبائلی جنگ چھڑ جائے گی، پورے بنی ہاشم کے ساتھ تصادم مول لینا پڑے گا، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔ لہٰذا الٹی میٹم گیا کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، یا تو راستے سے ہٹ جاؤ یا میدانِ جنگ میں آؤ۔ اس وقت چچا نے بھتیجے کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ اب ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے، دنیاوی سہارا اسی ایک خاندان کا تھا۔ (اصل سہارا تو اللہ تعالیٰ کا ہے، میں نے اسی لئے دنیاوی سہارا کہا ہے!) اور حضورؐ کو محسوس ہوا کہ اب یہ سہارا بھی ہٹ رہا ہے، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن وہی بات جو مدنی دور میں ہوئی ہے جب حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا ہے، جو آپ کے فرزند ارجمند تھے۔ اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، یہ ہے بشریت، مگر زبان پر یہ الفاظ تھے کہ ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں، آخر سینے میں دل ہے، پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ اس میں احساسات ہیں، انسانی احساسات ہیں، لیکن اس کے باوجود صبر ہے، ان احساسات کے علی الرغم جھیلنا اور برداشت کرنا ہی تو کمال ہے، اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو آئے ہیں۔ لیکن فرمایا یہی ہے کہ چچا جان! یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی یا میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا۔ چچا کے بھی آنسو نکل آئے۔ محبت جو فطری و طبعی تھی، وہ جاگی۔ انہوں نے بھی اپنا غصہ برقرار رکھا۔ طے کر دیا گیا کہ مقاطعہ کر دیا جائے بنی ہاشم کا، مکمل سوشل اینڈ اکنامک بائیکاٹ (SOCIAL AND ECONOMIC BYCOTT) کوئی لین دین نہیں۔ اُن کے ہاتھ نہ کوئی چیز بیچی جائے گی نہ اُن سے خریدی جائے گی۔ مجبور ہو کر وہ شعبِ ابی طالب کہیں یا شعب بنی ہاشم کہہ لیں گھاٹی کے اندر محصور ہو گئے، کوئی چیز اندر نہیں جا رہی (COMPLETE BLOCKADE)

اور تین برس تک یہی صورتِ حال رہی ۔ ۷،۸،۹ھ (سات ، آٹھ ، نو) نبوی ۔ تین سال ہیں ، بچے بلک رہے ہیں ، کھانے کو کچھ نہیں ۔ اس گھاٹی میں اگر کوئی جھاڑی بھی اس کے سب پتے کھائے گئے ، کبھی کوئی ہمّت کرتا ہے تو رات کے وقت چوری چھپے کچھ پہنچا دیا ، ورنہ وہ وقت بھی آیا ہے کہ بچے بلک رہے ہیں اور اس وقت کچھ نہیں ، سوائے اس کے کہ سوکھا چمڑا اُبال کر اُس کا پانی اُن کے حلق میں ٹپکا دیا گیا ۔ یہ ہیں وہ مراحل جو پیش آئے ۔ مَیں پھر کہوں گا ، یہ سب کچھ اس سطح پر ہو رہا ہے ، سب کچھ جھیل کر ہو رہا ہے ، سب کچھ برداشت کر کے ہو رہا ہے ۔ اس راہ میں جو سب پر گزرتی ہے وہ گزری ۔ یہ تو نہیں کہ حضورؐ اللہ تعالیٰ کے پیارے نہ تھے ، یہ بھی نہیں کہ اللہ کے لئے ممکن نہیں تھا کہ حضورؐ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا ۔ ناممکن ۔ لیکن پھر حجّت کیسے قائم ہوتی مجھ پر اور آپ پر ۔ بہر حال کچھ لوگوں کے اندر انسانیت کی دبی ہوئی چنگاری جاگی ۔ مقاطعہ کا جو معاہدہ تھا اُسے پھاڑ پھینکا ۔ یہ ۱۰ھ نبوی کا زمانہ ہے ، رہائی ملی ۔ اب وہ وقت آیا ہے ۔ یہ تیسرا دور ہوا کرتا ہے ۔ استہزاء ، تمسخر اور چٹکیوں میں اڑانا ۔ ۲۔ تشدّد PERSICUTION یہ دونوں حربے ناکام ہو گئے ، اب تیسرا حربہ آ گیا TEMPTATION یعنی لالچ کا ۔ مصالحانہ انداز میں سفارتیں آ رہی ہیں ۔ اب پھر ابو طالب کے پاس سفارت آئی ہے ۔ اپنے بھتیجے سے کہو کہ جو مانگنا ہے مانگ لے ، لیکن اس دعوت سے باز آ جائے ، بادشاہ بننا چاہتا ہے تو بادشاہ بنا دیتے ہیں ، اگر کہیں شادی کرنی ہے کسی گھرانے میں تو اشارہ کرے ، ہم شادی کرا دیتے ہیں ، دولت چاہیئے تو سیم و زر کے انبار اُس کے قدموں میں لگا دیتے ہیں ۔ پھر پیشی ہوئی ۔ حضورؐ نے فرمایا "چچا جان ! اگر یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور ایک پر چاند رکھ دیں ، تب بھی مَیں اپنی اس دعوت کو چھوڑنے والا نہیں ۔ لیکن دیکھئے کس طرح یہ سلسلہ چل رہا ہے ذرا شعب بنی ہاشم کی سختی ختم ہوئی ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور امتحان آیا ۔ ۱۰ھ نبوی کو حضورؐ نے عام الحزن (غم و اندوہ کا سال) کہا ۔ حضرۃ ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ بھی رحلت فرما گئیں ۔ اس طرح گھر کے اندر کا رفیق ، ہمّت بندھانے والا ساتھی ، دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات

چل بسیں، اُدھر خاندانی اور قبائلی سطح پر پشت و پناہ شخصیت ایک ہی سال میں دونوں انتقال کر گئے۔ اب کیا کیا جائے، اُدھر قریش کے سرداروں کا حوصلہ جوان ہو رہا ہے، راستہ کھُل گیا، دار الندوہ میں بیٹھ کر مشورے ہو رہے ہیں، قتل کے منصوبے بن رہے ہیں، کہ اب قصہ چکا دیا جائے، حضورؐ بھی حالات کے نتیجے کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک کوشش آپ کرتے ہیں کہ مکّہ میں تو اب کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ شائد طائف میں اللہ تعالیٰ کسی بڑے سردار کو اس بات کی توفیق دے دے کہ وہ میری رفاقت اختیار کرے۔ طائف کا سفر کیا سنہ نبوی میں پیدل کیا اور تنہا در آنحالیکہ صرف زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپؐ کے ساتھ تھے حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ نہ تھے۔ یہ وہ سفر ہے کہ جس میں وہ سائے کی طرح ساتھ رہنے والا ابوبکر صدیقؓ بھی ساتھ نہ تھا۔ عام راستہ چھوڑ دیا، اندیشہ تھا کہ قتل کر دیئے جائیں گے، اس لئے بڑا دشوار گزار پہاڑی راستہ اختیار کیا، طائف پہنچے ایک رئیس سے ملے، اس نے بڑا ہی جگر سے پار ہو جانے والا جملہ کہا: میں تم سے بات ہی کرنا نہیں چاہتا۔ تم اگر جھوٹے ہو تو اس قابل نہیں کہ تمہیں منہ لگایا جائے اور اگر تم سچّے ہو تو خطرہ ہے کہ اگر میں نے تمہاری توہین کر دی تو عذاب آجائے گا۔ اس لئے میں تو بات ہی نہیں کروں گا۔ تین سرداروں سے ملے، تینوں نے ایسے ہی جواب دیئے۔ اب وہ طائف کی گلیاں ہیں اور رحمۃ للعالمین ہیں — سیّد الاوّلین و الآخرین ہیں اور محبوب ربّ العالمین۔ ان میں سے کسی بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن عالم واقعہ میں ہو کیا رہا ہے۔ طائف کی گلیاں ہیں اور اوباش لوگوں کو پیچھے لگا دیا گیا ہے۔ ذرا ان کی جرأت، ان رسول صاحب کی۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کا نشانہ بنا کر پتھر مارے جاتے ہیں جیسے نقشہ ہوتا ہے کہ آپ کی مجلسوں میں کوئی دیوانہ اور اُس کے پیچھے اوباش لوگ لگے ہوئے ہوں، بچّے ہوں، تالیاں پیٹی جا رہی ہوں یہ ہے نقشہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا۔ پتھر لگ رہے ہیں، خون جاری ہے، نقاہت طاری ہو گئی ہے، ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آئے ہیں، ایک نے ادھر سے بغل میں ہاتھ ڈالا ہے اور دوسرے نے اُدھر سے اور کھڑا کر دیا کہ چلو! یہ ہے وہ کس مپرسی، یہ ہے وہ نقشہ کہ ؎

اِس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے سو گذری تنہا پسِ زنداں کبھی رُسوا سرِ بازار

مکّہ میں تین سال کی قید اور طائف کی یہ رُسوائی !— واپس آئے ہیں۔ مَیں پھر کہوں گا — ناکام، لیکن ناکام دُنیاوی سطح پر۔ یہ نقطۂ عروج ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذاتی مصائب کا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضؓ نے ایک دفعہ مدنی دَور میں سوال کیا (اُن کے اپنے شعور کی جو عمر ہے اُس میں یومِ اُحد سب سے زیادہ سخت دن تھا!) تو پوچھا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ سخت دن بھی کوئی آیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! طائف کا دن۔ اُحد کے دن تو آگے پیچھے حضورؐ کے جاں نثار تھے۔ لوگوں نے اپنے سینے ڈھال بنائے ہوئے تھے اور اپنے سینے چھلنی کروا لئے۔ لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ یکہ و تنہا ہیں، غلام کا تو کوئی STATUS نہیں تھا اُس معاشرے میں۔ یہ حالت درحقیقت نقطۂ عروج ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتی مصیبت کا۔ چنانچہ جب آپؐ طائف سے واپس آئے تو تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ پر بیٹھے، طبیعت بھر آئی جذبات اُمڈے، اُس وقت جو دعا مانگی ہے اور مناجات کی ہے، کلیجے میں شگاف ڈال دینے والی ہے۔ دُعا یہ ہے:

اللّٰھم انی اشکو الیک ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی النّاس، انت ارحم الرّٰحمین ورب المستضعفین وانت ربّی۔ الیٰ من تکلنی؟ الیٰ عدو بعید یتجھمنی او الیٰ عدو ملکتہ امری؟ ان لم یکن بک علیّ غضب فلا ابالی، غیران عافیتک ھی اوسع لی۔ اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت لہ الظلمات وصلح علیہ امر الدنیا والاٰخرۃ ان ینزل بی غضبک او یحل بی سخطک، لک العتبیٰ حتّیٰ ترضیٰ ولا حول ولا قوّۃ الّا باللّٰہ ط

"اے اللہ! میں تیری جناب میں شکایت لے کر آیا ہوں اپنی قوّت کی کمی اور اپنے وسائل کی قلّت کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے، اُس کا رونا کہاں رُوؤں۔ تو ارحم الرّاحمین ہے، تو کمزوروں کا ربّ ہے اور میرا بھی ربّ ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر دیا؟ مجھے دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جس طرح چاہے ستائے۔ کیا میرا معاملہ دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جو چاہے کرے!" ——— پھر ذرا رنگ بدلتا ہے اس دُعا کا اور

کہتے ہیں :

"اے اللہ! اگر تو ناراض نہیں ہے، تیری رضا اسی میں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ تیری مرضی پوری ہو۔ میں تیرے رُخِ انور کی ضیا کی پناہ میں آجاؤں گا!"

یہ ہے اصل میں وہ مقام جس کی طرف سورۂ آلِ عمران کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ٥

ایک وقت آتا ہے کہ رسول پکار اٹھتا ہے کہ اے اللہ! مدد کب آئے گی۔ سورۂ یوسف میں بھی آیا ہے : حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۔ ایک وقت آتا ہے کہ بالکل مایوسی کا اندھیارا ہوتا ہے کہیں کوئی اُمید کی کرن نظر نہیں آتی کہ کدھر جاؤں، سارے راستے بند ہیں، اس وقت رسول پکارتا ہے، وہی جو حضرت نوح علیہ السّلام نے صدا بلند کی تھی : رَبِّ اِنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ٥ (اے ربّ! میں مغلوب ہوا جاتا ہوں، مدد فرما!) پھر مدد آتی ہے : جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۔ چنانچہ ملکُ الجبال خدمت میں حاضر ہوتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔ اگر آپؐ چاہیں تو ان پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے اور طائف کے رہنے والے سرمہ بن جائیں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ نسلوں کو توفیق دے دے۔ چنانچہ خدا نے توفیق دی۔ محمدؐ بن قاسم باب الاسلام میں لانے والے۔ اس صنم کدۂ ہند میں توحید کا پیغام لانے والے کون تھے، ثقفی۔ بنو ثقیف سے ہی تھے، طائف کے رہنے والوں کی اولاد۔ مولینا مناظر احسن گیلانی نے ایک بات لکھی ہے کہ طائف کا دن حضورؐ کی زندگی میں ایک TURNING POINT ہے، ایک موڑ ہے۔ اس دن تک گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کے حوالے کیا ہوا تھا، جو چاہو کر لو ہمارے نبی سے، تمہیں کھلی چھوٹ ہے، جس طرح چاہو ستا لو اور جس طرح چاہو آزما لو۔ اُن کے صبر کا امتحان لے لو، اُن کی استقامت کا امتحان لے لو، کوئی بھی مافوق الفطرت رکاوٹ یا مدد نہیں

آئی۔ دس سال ہیں، یہ ایک آدھ دن کی بات نہیں۔ ذہن میں رکھئے یہ دس نبوی ہے۔ دس سال تک گویا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کیفیت سے دوچار رہے اللہ کی کوئی غیبی مدد نہیں آئی۔ جو بھی اِس دُنیا کا طریقہ ہے، اُسی کے مطابق زمین پر قدم بہ قدم چل کر جو بھی مسائل پیش آتے ہیں، جو بھی ناکامیاں ہوتی ہیں، جو بھی رسوائیاں ہوتی ہیں، جو بھی الزامات لگتے ہیں، جو استہزاء ہوتا ہے، جو تمسخر ہوتا ہے، جو ستایا جاتا ہے، وہ سب کچھ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہوا۔ بلکہ ہر چیز اپنے عُروج (CLIMAX) کو پہنچ کر اب ANTI CLIMAX پہ آگئی۔ طائف کا دن حضورؐ کے لئے TURNING POINT ہے۔ گویا وہ آخری حد آپہنچی اور اللہ کی طرف سے SPECIAL PROTECTION حاصل ہوگئی۔ واپس مکّے آئے ہیں مگر داخلہ ممکن نہیں تھا، مکّے سے تو گئے اسی لئے تھے کہ قتل کے فیصلے ہو رہے تھے۔ دنیوی اعتبار سے بے نیلِ مرام واپس آئے ہیں، کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مکّے میں تو کوئی الیسا دن آیا بھی نہیں تھا جو طائف میں آیا۔ مطعم بن عدی ایمان نہیں لائے لیکن ہم سب کی گردنوں پر اُن کا ایک احسان ہے۔ حضورؐ مکّے سے باہر رہے، پیغام بھیجا بہت شریف النفس انسان تھے۔ مطعم بن عدی سے کہا: مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو میں مکّے میں داخل ہوجاؤں۔ اُس نے کہہ دیا ہاں ٹھیک ہے، آپ میری پناہ میں آئیں۔ فرمایا یوں نہیں، خود آکر لے جاؤ، چھ بیٹوں کو لے کر آیا وہ شخص ہتھیار لگا کر، ورنہ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مکّہ میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ لیکن اب پانسہ پلٹتا ہے:

سالہ نبوی میں مدینہ منوّرہ سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں، موسم حج ہے حاجیوں کے پڑاؤ لگے ہوئے ہیں۔ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دعوت و تبلیغ کے لئے کبھی اس کیمپ میں اور کبھی اُس کیمپ میں۔ ابھی یہاں حاجیوں کے کسی قافلے کے پاس ہیں، ابھی وہاں ایک گھاٹی میں اچانک چھ یثربیوں سے ملاقات ہوگئی (مدینہ تو ابھی اس بستی کا نام نہیں پڑا تھا!) حضورؐ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اِن کنکھیوں میں پوری تاریخ مضمر ہے، وہ رہنے والے تھے مدینہ کے۔ وہاں یہود کے تین قبیلے تھے، یہودی اُن کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت آگیا ہے۔ اپنے علم کی بنیاد پر، اپنی کتابوں کی بنیاد پر، اپنے صحیفوں کی بنیاد پر اور دھمکایا

کرتے تھے کہ اب تو تم ہمیں دبا لیتے ہو، تم ہم پر غالب آجاتے ہو (وہی بنئے کے انداز میں کہ آ کے تو مار کے دیکھ!) اس وقت تو ہم دبے ہوئے ہیں کوئی بات نہیں۔ آخری نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ جب اُس کے ساتھ ہو کر ہم تمہارے ساتھ جہاد کریں گے تو تم غالب نہیں آؤ گے، ہم تم پر غالب ہو جائیں گے۔ انہوں نے دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں، جلدی کرو، ایمان لے آؤ مبادا یہود سبقت کر جائیں۔ ذرا سوچئے یہود کا علم فائدہ دے رہا ہے ان کو اور خود یہود کے لئے وہ حجاب بن گیا۔ مشہور ہے کہ: "اَلْعِلْمُ هُوَ الْحِجَابُ الْاَکْبَرُ" (کہ علم سب سے بڑا حجاب ہے!) لیکن یہ علم دوسروں کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ چھ آدمی ایمان لے آئے، کھڑکی کھل گئی، وہ جو پورا ماحول بند تھا۔ راستہ کہیں نہیں نکل رہا تھا۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ خالص خدائی تدبیر ہے، اِس میں کسی کی اپنی تدبیر کا کوئی دخل نہیں۔ سعی تو ساری آج تک مکے میں ہوئی اور مکے سے باہر سوچا بھی تو طائف کا سوچا۔ ایک سفر اور بھی کیا تھا آپؐ نے اور وہ بھی اسی طرح ناکام رہا تھا۔ یہ خالص خدائی تدبیر تھی کہ مدینے کے چھ افراد ایمان لے آئے۔ اگلے سال (سنہ ۱۲ نبوی میں) بارہ آدمیوں نے بیعت کی۔ یہ بیعت، بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کہلاتی ہے، اور درخواست کی کہ اب ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی کیجئے جو ہمیں قرانِ مجید پڑھائے۔

پھر نوٹ کر لیجئے، دعوت کی بنیاد قرآن، تبلیغ کی بنیاد قرآن، تعلیم و تربیت کی بنیاد قرآن۔ یہ ہے وہ INFRA STRUCTURE اس انقلاب کا۔ لوگ صرف SUPER STRUCTURE کو دیکھتے ہیں۔ اصل مضبوطی تو INFRA STRUCTURE سے ہے، وہ بنیاد کیا ہے — اکبر الٰہ آبادی نے کہا ہے اور خوب کہا ہے: ؎

خدا کے کام دیکھو، بعد کیا ہے اور کیا پہلے ؛ نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

تو اس کو پھیلائیے، اصل جڑ اور بنیاد کیا ہے۔ بارہ آدمی ایمان لائے، بیعتِ عقبۂ اُولیٰ ہوئی — کہا کہ ہمیں ایک شخص دیجئے جو قرآنِ پاک پڑھائے: ؎ "قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!"۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے TEEN-AGES - نوجوان تھے۔ کیسے نوجوان! بڑے ناز و نعم میں پلے ہوئے نوجوان۔ دو دو سو

ہم کا جوڑا جو شام سے تیار ہو کر آتا تھا، پہنتے تھے۔ عطر کی پوری پوری شیشیاں جسم پہ انڈیل کر نکلتے تھے۔ مکّے کی گلیوں میں لوگ دیکھتے تھے کہ کون جا رہا ہے۔ انتہائی خوش پوش، خوش شکل، خوش مذاق، خوش لباس۔ وہ ایمان لے آئے تھے، جس طرح خبابؓ بن ارتؓ قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں، حضرت مُصعبؓ کو ساتھ کر دیا گیا اور مدینہ منوّرہ میں قرآن کی تعلیم دینے لگے۔

ذہن میں رکھئے کہ مدینہ میں اُن کا نام پڑ گیا تھا المقری (پڑھانے والے!) جاء المقری (وہ آگئے پڑھانے والے) قرآن کے پڑھانے والے۔ ایک سال تک حضرت مصعبؓ نے محنت کی اور اگلے سال بہتّر مرد اور تین عورتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ کے ہاتھ پہ بیعت کر رہے ہیں۔ یہ ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس بیعت میں یہ طے ہوا کہ آپ ہمارے ہاں آجائیے، ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اُس وقت جو کچھ قول قرار ہوا اُس پہ بعض کہنے والوں نے کہا: اے یثرب والو! خوب سمجھ لو، خوب سوچ لو کہ کیا قول و قرار کر رہے ہو۔ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ساتھ لے کر جانا سُرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ چنانچہ انہوں نے بھی خوب سمجھ سوچ کر معاملہ کیا اور کہا کہ ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں، یہ ہے بیعتِ عقبۂ ثانیہ جو تمہید بنی ہے ہجرت کی۔ اِس کے بعد حکمِ خداوندی آیا اور ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ کوئی SPECIAL PROTECTION نہیں محاصرہ ہے۔ اِدھر بھی تو بات نقطۂ عُروج پہ پہنچ چکی ہے۔ دار الندوہ میں پورا نقشہ بن چکا ہے۔ قتل کردو اور قریش کے جتنے گھرانے ہیں اُن سب میں سے ایک ایک فرد قتل میں شریک ہو کہ بنی ہاشم چونکہ لڑائی تو نہیں لڑ سکیں گے، کس کس سے قصاص طلب کریں گے۔ ہر گھرانے کا ایک ایک شخص ہو، رات کی تاریکی میں پل پڑو۔ یہ بھی تعیّن نہ ہو سکے کہ محمدؐ کس کی تلوار سے ہلاک ہوئے (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پورا نقشہ یوں سمجھئے کہ اس قبائلی زندگی کے جو PROBLEMS ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھ کر PLANING تیار کی ہے اور مکمّل تیار کی ہے۔ اور شب ہے ہجرت کی اور شب ہے محاصرے کی۔ اس محاصرے میں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نکلے ہیں۔ یہ ہے وہ SPECIAL-PROTECTION۔ جو نظر نہیں آتی۔ غارِ ثور میں تین دن رہے ہیں اور ڈھونڈنے

نہ جا سکے۔ کھوجی عین غار کے دہانے تک لے گیا ہے تلاش کرنے والوں کو۔ کھوج لگانے والے بھی عضب کے ہیں۔ حالانکہ حضورؐ سیدھا مدینے کا رُخ کرنے کی بجائے بالکل دوسری طرف سے گئے ہیں جو بڑا دشوار گزار راستہ ہے۔ ۱۲ میل کی بڑی ہی سخت چڑھائی ہے، اور وہاں جا کر غارِ ثور میں آپؐ نے رُوپوشی اختیار کی ہے، لیکن پہنچنے والے وہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ تاہم اللہ کی قدرت دیکھئے، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بھی ایک دفعہ گھبرا گئے کہ حضورؐ ان میں سے کسی نے اگر غیر اختیاری طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو ہم پکڑے گئے۔ یہاں ہے وہ یقینِ نبوّت، وہ جو حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا: كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (نہیں میرے ساتھ میرا ربّ ہے، وہ راستہ نکال دے گا!) یہاں حضورؐ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (جنتا نہ کرو، تردّد نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے!) پھر وہاں سے تین دن کے بعد نکلے ہیں، پھر بھی تعاقب ہے، سَو اُونٹوں کا اعلان ہے، بہت بڑا اعلان ہے جو انعام لگا ہے کہ محمدؐ کو زندہ پکڑ لاؤ یا ان کا سر لے آؤ اور سَو اُونٹ لے لو! سُراقہ نے دَوڑ لگائی ہے، پہنچ بھی گیا ہے، لیکن جب قریب پہنچتا ہے، اُس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس جاتے ہیں، پھر توبہ کرتا ہے، باز آتا ہے، پھر وہ لالچ نظر آتا ہے، پھر دوڑ لگاتا ہے، تین مرتبہ پاؤں دھنستے ہیں۔ یہ ہے وہ SPECIAL PROTECTION — اِس کا انکار نہیں ہے، تائیدِ خداوندی کا انکار نہیں ہے۔ لیکن اصل بات یہ سمجھنے کی ہے کہ تائیدِ غیبی کب آتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کب آتی ہے جبکہ انسان اپنے صبر، اپنے ثبات سے، اپنی محنت سے، اپنے استقلال سے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کی مدد کا حقدار ہے۔ دس سال کا عرصہ سامنے رکھئے، اس کے بعد یہ راستہ کھلا ہے۔ کیسے کیسے امتحان اور کیسی کیسی آزمائشیں اور کیسی کیسی ناکامیاں پیش آئی ہیں۔ طائف کی دُعا کو ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کیجئے، جگر کو چھید دینے والی دعا ہے۔ بہرحال حضورؐ کی اس انقلابی جدّوجہد کا یہ IST ہے جو میں آج بیان کر چکا ہوں میرے پیشِ نظر تھا کہ ایک ہی تقریر میں اس کو مکمل کروں۔ لیکن جو بات بھی میرے سامنے آتی رہی ہے، اس کو بیان کرتا رہا، کوئی معیّن نقشہ نہیں تھا۔ میرا کل کے ضمن میں پروگرام تو یہ تھا کہ خلافتِ راشدہ کے موضوع پہ تقریر ہو گی۔ لیکن ابھی کل سیرۃ النبیؐ کا مدنی دَور ہے اور وہ اسی پر گفتگو جاری رہے گی۔ اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین ۝

 بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد یونس ایم۔اے، ایم۔ایڈ

قرآن اور آثارِ کائنات

زمین کی نباتات اور روئیدگی۔
توحید کا واضح ثبوت !!

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ٥ (الشعراء-۷،۸)

"اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں !"

جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحید الٰہ) انبیاء علیہم السّلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع واقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادّوں اور قوّتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اگ رہی ہیں، پھر اُن کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی ان گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک

خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی، اور ان کے وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

توحید کا واضح ثبوت سایہ اور روشنی زندگی کی علامات

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ (الفرقان-۵)

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں!"

اپنی طرف سمیٹنے سے مراد غائب اور فنا کرنا ہے۔ کیونکہ ہر چیز جو فنا ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف پلٹتی ہے، ہر شے اسی کی طرف آتی ہے اور اسی کی طرف جاتی ہے۔ اس آیت کے دو رُخ ہیں، ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ غفلت میں پڑے ہوئے مشرکین کو بتا رہی ہے کہ اگر تم دنیا میں جانوروں کی طرح نہ جیتے اور کچھ عقل و ہوش کی آنکھوں سے کام لیتے تو یہی سایہ جس کا تم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہو، تمھیں یہ سبق دینے کے لئے کافی تھا کہ نبی جس توحید کی تعلیم تمھیں دے رہا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ تمھاری ساری زندگی اس سائے کے مدّ و جزر سے وابستہ ہے۔ ابدی سایہ ہو جائے تو زمین پر کوئی جاندار مخلوق، بلکہ نباتات تک باقی نہ رہ سکے، کیونکہ سورج کی روشنی و حرارت ہی پر ان سب کی زندگی موقوف ہے۔ سایہ بالکل نہ رہے تب بھی زندگی محال ہے، کیونکہ ہر وقت سورج کے سامنے رہنے اور اس کی شعاعوں سے کوئی پناہ نہ پا سکنے کی صورت میں نہ جاندار زیادہ دیر تک باقی رہ سکتے ہیں نہ نباتات بلکہ پانی تک کی خیر نہیں۔ دھوپ اور سائے میں یک لخت تغیرات ہوتے نہیں تب بھی زمین کی مخلوقات

ان جھٹکوں کو زیادہ دیر تک نہیں سہار سکتی۔ مگر ایک صانع حکیم اور قادرِ مطلق ہے جس نے زمین اور سورج کے درمیان ایسی مناسبت قائم کر رکھی ہے جو دائماً ایک لگے بندھے طریقے سے آہستہ آہستہ سایہ ڈالتی اور بڑھاتی گھٹاتی ہے اور بتدریج دھوپ نکالتی اور چڑھاتی اتارتی رہتی ہے۔ یہ حکیمانہ نظام نہ اندھی فطرت کے ہاتھوں خود بخود قائم ہو سکتا تھا اور نہ بہت سے بااختیار خدا اسے قائم کر کے یوں ایک مسلسل باقاعدگی کے ساتھ چلا سکتے تھے۔

(سورۂ الفرقان۔ حاشیہ ۵۹ تفہیم القرآن)

بارش۔ نباتی و حیوانی زندگی اور نظریہ توحید

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ (النمل - ۶۰)

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لئے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوش نما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمھارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟"

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اسی پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجئے: زمین میں اس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لئے درکار ہے، اور پانی کے اندر ٹھیک وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لئے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے۔ کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ

تدبیر اور غالب قدرت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزارہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اس باقاعدگی سے رُونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی، جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو، اسے ایک مرا اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند عاقل انسان کے لئے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔

سورۃ النمل حاشیہ ۷۳ تفہیم القرآن جلد سوم

خلق اور اعادۂ خلق۔

وجود الٰہ اور وحدتِ الٰہ پر دلائل

اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ (النمل-۶۴)

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟"

یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اترتا جاتا ہے، اتنے ہی وجودِ الٰہ، اور وحدتِ الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھئے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اس وقت تک مسلّم سائنٹیفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادّے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کے لئے جتنے عوامل درکار ہیں، اُن سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آنا دہریوں کا ایک غیر معمولی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (LAW OF CHANCE) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (LABORATORIES) میں بے جان مادّے سے جاندار مادّہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے، وہ صرف مادّہ ہے جسے اصطلاح میں (D.N.A) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادّہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ حیات تو ضرور ہے مگر خود جاندار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے، جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھئے! زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آرہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (DESIGN) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے، جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ متحجرات (FOSSILS) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خفتی مشکل کہیں نہیں ملا۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور سڑہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق الباریٔ المصوّر ہی نے زندگی کو متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ، اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجئے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (MECHANISM) رکھ دیا ہے، جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اس کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے، اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسل (GENETICS) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر بیج دے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے، جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات

کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (CELL) کے ایک حصّے میں ہوتا ہے، جسے بمشکل انتہائی طاقتور خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو حتماً اس راستے پر ڈالتا ہے، جو اس کی اپنی صورت نوعیہ کا راستہ ہے۔ اس کی بدولت گیہوں کے ایک دانہ سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں جہاں کہیں پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رُونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانہ جو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ ناقابلِ تصوّر وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے، جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالد و تناسل کے اس خود بینی نظم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصّے میں لئے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پُرپیچ عملیات (PROGRESSES) کو دیکھے، جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخم تناسل اس نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے، اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملیئن افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لئے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے طریقے پر چلتے رہنے کے لئے بھی ایک ناظم و مدبّر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لئے بھی ان کارخانوں کی نگرانی و رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جنّ یا نبی یا ولی ذرّہ برابر بھی کوئی حصّہ رکھتا ہے، اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصّب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلا جا رہا ہے۔

سورۃ النمل حاشیہ ۸۰ تفہیم القرآن جلد سوم

بارش ــــ حیات بعد الموت اور نظریہ توحید

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِۦ بِهِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

(الروم ۲۴)

"اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے"

یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسری یہی چیز اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے، اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اس پیداوار پر ہے جو زمین سے نکلتی ہے۔ اس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیتِ بارآوری پر ہے۔ اس صلاحیت کے رو بکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہِ راست زمین پر برسے یا اس کے ذخیرے سطح زمین پر جمع ہوں، یا زیر زمین چشموں اور کنوؤں کی شکل اختیار کریں، یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر اس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے تغیر اور ردّ و بدل پر، فضائی حرارت و برودت پر، ہوا کی گردش پر اور اس بجلی پر ہے جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ان تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر ان سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لئے صریحاً ساز گار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک ان کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل ساز گاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اُس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی حرارت، برودت اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے سورۂ الروم حاشیہ ۳۵ تفہیم القرآن

آسمانوں کی حقیقت ــــ توحید کا اثبات
دہریت اور شرک کا ابطال

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یٰس - ۴۰)

"نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں!"

فلک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (ORBIT) کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور اس کا مفہوم سماء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ یہ ارشاد کہ "سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں!" چار حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیارے اور اجرام فلکی متحرک ہیں، دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے، تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لئے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں، بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

ان آیات کا اصل مقصد علم ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا، اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد و حساب دلائل آئیں گے، اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظام شمسی میں شامل ہے، اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز (سورج) زمین سے ۳۔ لاکھ گنا بڑا ہے، اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲۔ ارب ۷۹ کروڑ ۳۰۔ لاکھ میل ہے۔ بلکہ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴۔ ارب ۶۰ کروڑ میل دور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظام شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے جس کہکشاں (GALAXY) میں ہمارا یہ نظام شمسی شامل ہے، اس میں تقریباً ۳۔ ہزار

ملین (۳- ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴- سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰- لاکھ کوکبی سحابیوں (SPIRAL NEBULAE) میں سے ایک ہے اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰- لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰- کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصّہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق ہم پہنچی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم اس مادّے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے، اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو زمین کی دنیا میں کارفرما ہے ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دُور دراز دُنیاؤں کے مشاہدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے، اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرماں روا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم، جو حکمت، جو صنّاعی اور جو مناسبت ان لاکھوں کہکشانوں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیّاروں میں پائی جاتی ہے، اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحبِ عقل انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو گیا ہے؟ اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع، اور اس مناسبت کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے؟ (سورۂ یٰس حاشیہ ۳۷ تفہیم القرآن جلد چہارم)

توحید اور قانونِ تزویج

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (یٰسٓ - ۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا اُن اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں!"

یہ توحید کے حق میں ایک اور استدلال ہے اور یہاں پھر پیش پا افتادہ حقائق ہی میں سے بعض کو لے کر بتایا جا رہا ہے کہ شب و روز جن اشیاء کا تم مشاہدہ کرتے اور یونہی غور و خوض کئے بغیر گذر جاتے ہو، انہی کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑ تو خود انسان کا اپنا سببِ پیدائش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادّہ کے ازدواج سے چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ ان میں تزویج کا اُصول کام کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ بے جان مادّوں تک میں مختلف اشیاء جب ایک دوسرے سے جوڑ کھاتی ہیں تب کہیں اُن سے طرح طرح کے مرکّبات وجود میں آتے ہیں۔ خود مادّے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے ارتباط سے ہوئی ہے۔ یہ تزویج جس کی بدولت یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے، حکمت و صنّاعی کی ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں اپنے اندر رکھتی ہے، اور اس کے اندر ہر دو زوجین کے درمیان ایسی مناسبتیں پائی جاتی ہیں کہ بے لاگ عقل رکھنے والا کوئی شخص نہ تو اس چیز کو ایک اتفاقی حادثہ کہہ سکتا ہے، اور نہ یہ مان سکتا ہے کہ مختلف خداؤں نے ان بے شمار ازواج کو پیدا کر کے اُن کے درمیان اس حکمت کے ساتھ جوڑ لگائے ہوں گے۔ ازواج کا ایک دوسرے کے لئے جوڑ ہونا اور ان کے ازدواج سے نئی چیزوں کا پیدا ہونا، خود وحدتِ خالق کی صریح دلیل ہے۔

(سورۂ یٰس حاشیہ ۳۱ - تفہیم القرآن جلد چہارم)

سورۃ الذّٰریٰت - ۴۹ میں فرمایا:

"اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو!"

مطلب یہ کہ ساری کائنات کا تزویج کے اُصول پر بنایا جانا اور دُنیا کی تمام اشیاء کا زوج زوج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وُجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے، اگر تم غور کرو تو اس سے خود تمھاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے اور کوئی چیز اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی، تو دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جوڑ ہو سکتی ہے؟ اس کا جوڑ لازماً آخرت ہے، وہ نہ ہو تو یہ قطعاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔ سورۃ الذّاریات - حاشیہ ۴۰ - تفہیم القرآن جلد پنجم

زمین میں نباتات کی ایک حد، اللہ کی قدرت و حکمت کا نشان

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ (الحجر - ۱۹)

"ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک تُلی مقدار کے ساتھ اگائی!"

اس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع میں تناسل کی اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع مل جاتا تو چند سال کے اندر روئے زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کیلئے کوئی جگہ نہ رہتی۔ مگر یہ ایک حکیم اور قادرِ مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے، جس کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اس زمین پر اُگ رہی ہیں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس منظر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہر نوع کی جسامت، پھیلاؤ، اُٹھان اور نشو و نما کی ایک حد مقرر ہے، جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز نہیں کر سکتی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کس نے ہر درخت، ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کے لئے جسم، قد، شکل، برگ و بار اور پیداوار کی ایک مقدار پورے ناپ

قول اور حساب شمار کے ساتھ مقرر کر رکھی ہے۔
(سورۃ الحجر۔ حاشیہ ۱۳ تفہیم القرآن جلد دوم)

اللہ واحد اور قدرت والا ہے، کرۂ زمین پر پانی کی مقدار

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ
(المؤمنون - ۱۸)

"اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھیرا دیا"

اس سے مراد اگرچہ موسمی بارش بھی ہو سکتی ہے، لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے ایک دوسرا مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آغازِ آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اتنی مقدار میں زمین پر پانی نازل فرمایا تھا، جو قیامت تک اس کرّہ کی ضروریات کے لئے اس کے علم میں کافی تھا۔ وہ پانی زمین ہی کے نشیبی حصّوں میں ٹھہر گیا جس سے سمندر اور بحیرے وجود میں آئے اور آبِ زیرِ زمین (SUB SOIL WATER) پیدا ہوا۔ اب یہ اس پانی کا الٹ پھیر ہے، جو گرمی، سردی اور ہواؤں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ اس کو بارشیں، برف پوش پہاڑ، دریا چشمے اور کنوئیں زمین کے مختلف حصّوں میں پھیلاتے رہتے ہیں، اور وہی بے شمار چیزوں کی پیدائش اور ترکیب میں شامل اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے۔ شروع سے آج تک پانی کے اس ذخیرے میں نہ ایک قطرے کی کمی ہوئی اور نہ ایک قطرے کا اضافہ ہی کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پانی، جس کی حقیقت آج ہر مدرسے کے طالب علم کو معلوم ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن دو گیسوں کے امتزاج سے بنا ہے ایک دفعہ تو اتنا بن گیا کہ اُس سے سمندر بن گئے، اور اب اس کے ذخیرے میں ایک قطرے کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ کون تھا جس نے بیک وقت میں اتنی ہائیڈروجن، اور آکسیجن ملا کر اس قدر پانی بنا دیا؟ اور کون ہے جو اب انہی دونوں گیسوں کو اس خاص

تناسب کے ساتھ نہیں ملنے دیتا جس سے پانی بنتا ہے۔ حالانکہ دونوں گیسیں اب بھی دنیا میں موجود ہیں ؟ کیا دہریوں کے پاس اس کا کوئی جواب ہے ؟ اور کیا پانی اور ہوا اور گرمی اور سردی کے الگ الگ خدا ماننے والے اس کا کوئی جواب رکھتے ہیں ؟

(سورہ المومنون حاشیہ تفہیم القرآن جلد سوم)

سمندر میں آبِ شور اور آبِ شیریں
اللہ واحد و قادر مطلق

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا
مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ○

(الفرقان ۵۳)

"اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ۔ ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے !"

یہ کیفیت ہر اس جگہ رُونما ہوتی ہے، جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں۔ جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب "مراۃ الممالک" میں جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لئے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیج فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران کے پاس کنوئیں کھود لئے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہہ میں آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے لوگ کچھ مدّت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔

(سورہ الفرقان حاشیہ ۶۸ تفہیم القرآن جلد سوم)

سورۃ النمل آیت ۶۱ میں فرمایا:

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کئے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے؟"

یعنی میٹھے اور کھاری پانی کے ذخیرے جو اس زمین پر موجود ہیں، مگر باہم خلط ملط نہیں ہوتے، زیر زمین پانی کی سوتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لے کر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور ان کی دھار سمندر کے پانی سے اس طرح الگ ہوتی ہے کہ بحری مسافر اس میں سے پینے کے لئے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔

(سورۃ النمل حاشیہ ۷۵۔ تفہیم القرآن جلد سوم)

زمین کی روئیدگی، حکمت و قدرت اور ربوبیت پر استدلال !!

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ (یٰس ۳۳)

"ان لوگوں کے لئے بے جان زمین ایک نشانی ہے۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں!"

ان مختصر فقروں میں زمین کی روئیدگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمی شب و روز اس زمین کی پیداوار کھا رہا ہے، اور اپنے نزدیک اسے ایک معمولی بات سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ غفلت کا پردہ چاک کر کے نگاہِ غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ اس فرشِ خاک سے لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز باغوں کا اُگنا اور اس کے اندر چشموں، اور نہروں کا رواں ہونا کوئی کھیل نہیں ہے جو آپ سے آپ ہوا جا رہا ہو، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت و قدرت اور ربوبیت کارفرما ہے۔ زمین کی حقیقت پر غور کیجئے، جن مادّوں سے یہ مرکّب ہے ان کے اندر بجائے خود کسی نشوونما کی طاقت نہیں ہے۔ یہ سب مادّے فرداً فرداً بھی اور مرکّب و آمیزش کے بعد بھی بالکل غیر نامی ہیں اور اس بنا پر

ان کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان زمین کے اندر سے نباتی زندگی کا ظہور آخر کیسے ممکن ہوا؟ اس کی تحقیق بھی آپ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ چند بڑے بڑے اسباب ہیں جو اگر پہلے فراہم نہ کر دیئے گئے ہوتے تو یہ زندگی سرے سے وجود میں نہ آسکتی تھی۔

اوّلاً زمین کے مخصوص خطّوں میں اس کی اوپری سطح پر بہت سے ایسے مادّوں کی تہہ چڑھائی گئی جو نباتات کی غذا بننے کے لئے موزوں ہو سکتے تھے، اور اس تہہ کو نرم رکھا گیا تاکہ نباتات کی جڑیں اس میں پھیل کر اپنی غذا چوس سکیں۔

ثانیاً۔ زمین پر مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ غذائی مادّے اس میں تحلیل ہو کر اس قابل ہو جائیں کہ نباتات کی جڑیں ان کو جذب کر سکیں۔

ثالثاً۔ اوپر کی فضا میں ہوا پیدا کی گئی جو آفاتِ سماوی سے زمین کی حفاظت کرتی ہے۔ جو بارش لانے کا ذریعہ بنتی ہے، اور اپنے اندر وہ گیسیں بھی رکھتی ہے جو نباتات کی زندگی اور ان کے نشوونما کے لئے درکار ہیں۔

رابعاً۔ سورج اور زمین کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا کہ نباتات کو مناسب درجۂ حرارت اور موزوں موسم مل سکیں۔

یہ چار بڑے بڑے اسباب (جو بجائے خود بے شمار ضمنی اسباب کا مجموعہ ہیں)۔ جب پیدا کر لئے گئے تب نباتات کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ پھر یہ سازگار حالات فراہم کرنے کے لئے نباتات پیدا کئے گئے، اور ان میں سے ہر ایک کا تخم ایسا بنایا گیا کہ جب اسے مناسب زمین، پانی، ہوا اور موسم میسّر آئے تو اس کے اندر نباتی زندگی کی حرکت شروع ہو جائے۔ مزید برآں اس تخم میں یہ انتظام کر دیا گیا کہ ہر نوع کے تخم سے لازماً اسی نوع کا بوٹا اپنی تمام نوعی اور موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہو، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید کاریگری یہ کی گئی کہ نباتات کی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بے حد و حساب قسمیں پیدا کی گئیں، اور ان کو اس طرح بنایا گیا کہ وہ ان بے شمار اقسام کے حیوانات اور بنی آدم کی غذا، دوا، لباس اور ان گنت دوسری ضرورتوں کو پورا کر سکیں جو نباتات کے بعد زمین پر وجود میں لایا جانے والا تھا۔

اس حیرت انگیز انتظام پر جو شخص بھی غور کرے گا، وہ اگر ہٹ دھرمی اور تعصب میں مبتلا نہیں ہے، تو اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صریح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ کام کر رہا ہے، جس کے تحت زمین، پانی، ہوا اور موسم کی مناسبتیں نباتات کے ساتھ، اور نباتات کی مناسبتیں حیوانات اور انسانوں کی حاجات کے ساتھ انتہائی نزاکتوں اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔ کوئی ہوشمند انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی ہمہ گیر مناسبتیں محض اتفاقی حادثے کے طور پر قائم ہو سکتی ہیں۔ پھر یہی انتظام اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ بہت سے خداؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک ہی ایسے خدا کا انتظام ہے، اور ہو سکتا ہے جو زمین، ہوا، پانی، سورج، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی کا خالق و ربّ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے خدا الگ الگ ہوتے تو آخر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور گہری حکیمانہ مناسبتیں رکھنے والا منصوبہ بن جاتا اور لاکھوں کروڑوں برس تک اتنی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہتا۔

رات اور دن - توحید اور ربِ قدیر و حکیم

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝
(یٰسٓ - ۳۷)۔

"ان کے لئے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے!"

رات اور دن کی آمد و رفت بھی انہی پیش پا افتادہ حقائق میں سے ہے جنہیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آ رہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گذرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں، تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک ربِّ قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جا سکتا اور رات کبھی نہیں آ سکتی، جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ ہٹے۔ دن کے ہٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے، وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطے نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات

اور دن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے۔ اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے ہٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصے پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصے پر ہمیشہ دن رہتا۔ یا شب و روز کا الٹ پھیر بہت تیز یا بہت سست ہوتا۔ یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن نکل آتا اور کبھی رات چھا جاتی تو ان تمام صورتوں میں اس کرے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ بلکہ غیر زندہ مادّوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کارفرمائی صاف دیکھ سکتا ہے، جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضرورت کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں۔ خدا کا وجود اور اس کی توحید اگر کسی شخص کے نزدیک بعید از عقل ہے تو وہ خود بھی سوچ کر بتائے کہ اس کارگیری کو بہت سے خداؤں کی طرف منسوب کرنا، یا یہ سمجھنا کہ کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت کے تحت یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے، کس قدر عقل سے بعید ہونا چاہیے، کسی ثبوت کے بغیر محض قیاس و گمان کی بنیاد پر جو شخص یہ دوسری سراسر نامعقول توجیہات مان سکتا ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں نظم اور حکمت اور مقصدیت کا پایا جانا خدا کے ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہے، تو ہمارے لئے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ شخص کسی نظریے یا عقیدے کو قبول کرنے کے لئے کسی درجے میں بھی کافی یا ناکافی عقلی ثبوت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ (سورۂ یٰس حاشیہ ۳۲ تفہیم القرآن جلد چہارم)

تسخیرِ آب۔ صاف پانی۔ قدرتِ الٰہی و حکمتِ ربّی

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا

فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الواقعہ ۶۸ تا ۷۰)

"کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟"

اس فقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں، جب وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے، اور صرف اپنے اصل آبی اجزاء کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھتیں، ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روئے زمین کو زمینِ شور بنا دیتی۔ نہ انسان اس پانی کو پی کر جی سکتا تھا، نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اُگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر پانی کی شکل میں برستا ہے، اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آب رسانی و آبپاشی کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اس کو خوب سوچ سمجھ کر بالارادہ اس مقصد کے لئے ودیعت کیا ہے کہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پا سکتی تھی، وہ اس نے سمندر میں پیدا کی، اور وہاں وہ خوب جی رہے ہیں۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا، اس کی پرورش کے لئے میٹھا پانی درکار تھا۔ اور اس کی فراہمی کے لئے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر

تحلیل ہوگئی ہو۔ (سورۃ الواقعہ - حاشیہ ۳۰ - تفہیم القرآن جلد پنجم)

روشن اور گرم سورج - اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانی

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ (سورۃ النبأ - ۱۳)

"اور ہم نے ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا!"

مراد ہے سورج - اصل میں لفظ وھاج استعمال ہوا ہے، جس کے معنی نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی - اس لئے ترجمہ میں ہم نے دونوں معنے درج کر دیئے ہیں - اس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے ۳ - لاکھ ۳۳ - ہزار گنا زیادہ بڑا ہے - اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے - زمین سے ۹ - کروڑ ۳۰ - لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے - تو اپنی بینائی کھو بیٹھے، اور اس کی گرمی کا یہ حال ہے کہ زمین کے بعض حصوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجۂ حرارت ۱۴۰ - ڈگری فارن ہیٹ تک پہنچ جاتا ہے - یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے، اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد - اس وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے - اس قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں جو ہمارے لئے سبب حیات بنے ہوئے ہیں - اس سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے - اس کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے، جو ہواؤں کے ذریعے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں - اس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے چلی جا رہی ہے -

(سورۃ النبأ - حاشیہ ۱۰ - تفہیم القرآن جلد ششم)

- قسط اوّل تمام شد - بعون اللہ تعالیٰ و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ محمدؐ و آلہ الطیبین الطاہرین -

خطوط و آراء

محترمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مجلہ 'میثاق' میں آپ نے میری ناچیز تالیف کا ایک باب شائع کرکے جس ذرّہ نوازی سے مجھے یہ اعزاز بخشا، اُس کے لئے سراپا سپاس ہوں- یہ اعزاز مجھے اس لئے بھی عزیز تر ہے' کہ اس سے میرے محبوب (مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور) کی یاد تازہ ہوئی- جن کی یاد میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، جوتادمِ آخر رہے گی-

شکریہ اُسی وقت پیشِ خدمت کردیتا، لیکن آپ اُس وقت سفرِ امریکہ وغیرہ پر روانہ ہوچکے تھے- لہٰذا واپسی کا انتظار کرنا پڑا- دُنیاوی سفر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وسیلۂ ظفر ہے- ہوگا، لیکن دینی غرض سے سفر کرنے والے (سائحون) کا تو یہ سفر فلاحِ دارین (ذات و عوام ہردو کے لئے) کا باعث ہوتا ہے، اورقرآن اِس پر شاہد ہے- اگر مجھے آپ کے اس سفر کا علم پہلے سے ہوتا تو مَیں اپنے تینوں بیٹوں، مقیم امریکہ، سویڈن اور انگلینڈ کو لکھ دیتا کہ وہ آپ کے وعظ و ارشاد کی مجالس میں حاضر ہوکر فیض حاصل کریں یہ امر میرے لئے باعثِ طمانیت اور ان کی اصلاح کے لئے مفید ہوتا- بہرحال عرض ہے کہ آپ میرے اور میری اولاد (خاص کر بیٹوں) کے لئے دعا فرمایا کریں، تاکہ میری پریشانیوں (جو اُن کے دیارِ غیر میں متوطن ہونے سے پیدا ہو رہی ہیں) کے ازالہ کے بوجوہِ احسن اسباب پیدا ہوجائیں -- اس خبر کے سننے سے بے حد خوشی ہوئی (اور ہر اہلِ نظر و علم کو ہوئی ہوگی) کہ امریکہ میں مولینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا دوسرا جنازہ آپ کی امامت میں پڑھا گیا- جزاک اللہ —— !!

آپ کی صحیح تاریخِ واپسی کا علم نہیں، زیادہ انتظار (جذباتِ شکریہ کے ادا کرنے کا) بھی نہیں کرسکتا- لہٰذا عریضہ ہذا، خدمتِ عالی میں ارسال ہے کہ اگر میں آپ کی واپسی پر آپ کا استقبال کرنے کے لئے حاضر نہیں ہوسکتا، تو میرا یہ عریضہ ہی آپ کا استقبال کرسکے- والسلام

محتاجِ دُعا

دارالشفاء ایبٹ آباد — ٥ - ١٠ - ٧٩ — شیر بہادر خاں

۲ — محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب دام فیوضکم العالی

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوں گے کل ہی اپنے محسن و کرم فرما جناب ڈاکٹر احمد توفیق صاحب مدظلہٗ کی خصوصی عنایت سے آپ کی دو بصیرت افروز بلکہ ایمان افروز کتب "عظمتِ صوم" اور "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" موصول ہوئیں۔ مَیں چونکہ ایک راہ گم کردہ شخص ہوں، اور ایمان کی لذت کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں کھا رہا ہوں، بلکہ بقول آپ کے "کبھی سوز و سازِ رومی" اور "کبھی پیچ و تابِ رازی" کی منزلوں میں ہوں۔ خود خداوندِ قدّوس نے بھی ایمان کی حقیقت کو اپنے کلامِ پاک میں جابجا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً سورۂ الحجرات کے آخری رکوع کی یہ آیات آپ جیسے عارفِ کلامِ ربّانی کی نگاہ میں ہوں گی، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ..... (الآیہ)

پھر ذرا آگے بڑھئے تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح فرما دی گئی کہ ایمان کی یہ دولتِ عظمیٰ، اس کی حلاوت، اس کی تکمیل سب اُسی ذاتِ برحق کے ہاتھ میں ہے اور اُسی کے احسان ہی سے یہ نعمتِ عظمیٰ ملتی ہے ..... بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

مَیں نے آپ کی دونوں کتب ذرا غور سے اور ایک پیاسے کی حیثیت سے پڑھیں آپ نے رُوح کی حقیقت، اور خالق و مخلوق کے نازک رشتے کو جس خوبی اور صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، یہ آپ ہی کا حصّہ ہے اور ؎

"اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن!"

جس پیارے انداز سے آپ برمحل لائے ہیں، شاید خود شاعر کو بھی اس کا صحیح ادراک نہ ہو۔ خوئی قسمت سے مَیں مسجد میں معتکف ہوں اور جو سوالات آپ نے اُٹھائے یعنی آیا ہم قرآن حکیم پر پورا ایمان لائے ہیں یا نہیں؟ مَیں نے کافی سوچا اور یقین کیجئے مجھے تو اپنے اوپر شک ہے، اور پھر جو علاج آپ نے تجویز فرمایا اُسی طرح کوشش کر کے تلاوت شروع کی، ایک عجیب لطف تھا، اس سپردگی اور وارفتگی میں ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ❊ می بُرد ہر جا کہ خاطرخواہِ اوست!

تلاوت کے بعد نوافل شکرانہ پڑھے۔ جناب ڈاکٹر توفیق صاحب اور آپ کے لئے

دو رو کر دعائیں کیں کہ آپ کے علم، ایمان، اسلام، عافیت اور اس جذبۂ خدمتِ دین میں ہر لمحے اضافہ فرمائے۔ اور ہم جیسے کج فہموں اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لانے اور جمانے کا ذریعہ فرمائے۔ آمین!

آپ کا وقت بہت قیمتی ہے، مَیں فضول باتوں میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا صرف چند ٹوٹے پھوٹے خیالات اور تأثرات الٹے سیدھے بیان کر دیئے ہیں۔ امید ہے آپ میری اس جسارت کا بُرا نہیں منائیں گے، کہ بغیر کسی تعارف کے اتنا طویل اور بے ربط خط لکھ دیا۔ اب مطلب کی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ کی یہ دونوں کتب میرے لئے تشنگیٔ ایمان بڑھانے کا سبب بنی ہیں، اور آپ ہی اس کا مداوا فرمادیں گے۔ آپ کے خیالات بڑے واضح اور دو ٹوک ہیں۔ میں جب بھی خداوندِ قدّوس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں، ہمیشہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور بارہا "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ!" کی کیفیت محسوس کی ہے۔ لیکن پھر کوئی اُفتاد آن پڑتی ہے، اور اسفل السّافلین میں جا گرتا ہوں، پھر سنبھلنے اور ابھرنے میں کافی دیر اور محنت لگتی ہے، اور بقول غالبؔ مرحوم۔ ؏ "مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!" کا چکر چل پڑتا ہے۔ اور جو حجابات بمشکل دُور ہوئے ہوتے ہیں، وہ موج در موج پھر قلب و ذہن کو تشکیک اور بے یقینی کے اتھاہ سمندروں میں غرق کر دیتے ہیں۔ اس لئے نماز، تلاوت، تہجّد اور ذکر اذکار میں وہ لطف نہیں ملتا، جس کی مجھے تلاش ہے۔ اسی موتی کی تلاش میں (یعنی ایقان و عرفان کی دولت) کبھی نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں اور کبھی تفاسیر و سیرت کی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ آج کل تفسیر ابن کثیر بحمد اللہ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جہاں عقدے کھلتے ہیں وہاں کئی گرہیں اور سخت پڑجاتی ہیں آپ میری رہنمائی فرمائیں (جو کتب ازراہِ کرم رعایتی قیمت پر ارسال فرماسکیں، ضرور بھیجئے) تاکہ مجھے استقامت اور سکونِ قلب نصیب ہو اور اطمینان سے اپنے ربّ کی عبادت کر سکوں۔ شیطانی وساوس نہ گھیریں اور "نیچے دروں، نیچے بروں!" یا: لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ کی جو کیفیت ہے، وہ ختم ہو۔ اور ایمان کی شمع قلب میں ایسی روشن ہو کہ کوئی آندھی، کوئی طوفان اسے بجھا نہ سکے۔ آمین — والسّلام

آپ کا دُعاگو : قمر آفریدی

کوہاٹ

۱۹-۸-۷۹

مرتب

نقد و تبصرہ

نام کتاب ..... پاکستان میں مسیحیت

مصنف ..... ڈاکٹر محمد نادر رضا صدیقی

ناشر ..... مسلم اکاڈمی ۱۹/۸ محمد نگر علامہ اقبال روڈ، لاہور

قیمت ..... چالیس روپے

یہ حقیقت کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا، اتنی بار دُہرائی جا چکی ہے کہ اب اس کا اعادہ تحصیلِ حاصل معلوم ہوتا ہے۔ ہم پورے سات سال تک دُنیا کو بتاتے رہے کہ مسلمان، کسی دوسری قوم کا محض ایک اقلیتی فرقہ نہیں بلکہ وہ ایک الگ، مستقل اور منفرد ملّت ہیں۔ ان کے عقائد و نظریات، ان کی عبادت کے طور طریقے اور ان کی تہذیب و ثقافت، غرض ہر چیز برِّ صغیر کے دوسرے باشندوں سے مختلف و متضاد ہے اور ہم اپنی زندگی انہی امتیازات کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اکثریّت کے علاقے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ہم پوری آزادی کے ساتھ اپنی اس تہذیب و ثقافت

پاکستان بن جانے کے بعد ہمارا فرض تھا کہ ہم نے یہ ملک جس اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا، اُس کا نہ صرف تحفّظ کرتے، بلکہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ بھی کرتے۔ مگر مسلمانوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔ اُن کے دینی جذبات کو اشتعال دلا دیا جائے تو وہ آگ کے سمندروں میں کود جاتے اور پہاڑوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ لیکن عام حالات میں وہ اپنے دین سے متعلق بڑے لاپرواہ واقع ہوئے ہیں اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس کے فروغ و ترقی کیلئے وہ کوئی سنجیدہ کوشش کرنے پر کم ہی آمادہ ہوتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی مسلمانوں نے اپنے دین کے بارے میں واقعی اسی لاپرواہی اور تغافل کا ثبوت دیا ہے۔ دولت و اقتدار کے نئے مواقع پیدا ہونے پر وہ ان سے فائدہ اٹھانے میں مگن رہے، اور یار لوگوں نے اس دینی قلعہ میں نقب لگانی شروع کر دی۔ ان نقب زنوں میں کچھ تو اپنی ہی آستین کے سانپ نکلے اور کچھ باہر کے۔ ان باہر کے نقب زنوں میں عیسائیت سرِ فہرست ہے۔

ہماری حد سے بڑھی ہوئی رواداری سے اس نے کس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور انسانی ہمدردی کے نام پر ٹسوے بہانے والا یہ مگر مچھ ہمارے ملّی وجود کو کس طرح آہستہ آہستہ نگلتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب نے خوفناک اور روشن

دینے والے انکشافات کئے ہیں۔ کتاب کا نام "پاکستان میں مسیحیت" ہے اور اس کے مصنف ہیں، ڈاکٹر محمد نادر رضا صدیقی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مصنف نے یہ کتاب بڑی محنت و عرق ریزی سے لکھی ہے۔ انہوں نے مسیحیت کی حقیقت، اُس کی تعلیمات، اُس کے مذہبی مآخذ، عیسائی معاشرے کے لئے اُس کی افادیت و عدم افادیت، اُس کے ماننے والوں کے باہمی اختلافات اور اُن کی فرقہ بندی، اُس کے تبلیغی مشنز، اُن کے طریق کار، اُن کے مقاصد اور پاکستان میں مسیحیت کی روز افزوں ترقی سے متعلق اعداد و شمار اور اس کی وجوہات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ہمارے خیال میں، اس موضوع کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ فاضل مصنف نے انتہائی محنتِ شاقہ سے اسے ترتیب دے کر ملتِ اسلامیہ پاکستان پر صرف احسانِ عظیم ہی نہیں کیا جس کیلئے وہ پوری قوم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے اس پر اتمامِ حجت بھی کر دیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پوری قوم کی آنکھیں کھل جائیں گی، اور وہ اپنے دین کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش بروئے کار لائے گی۔ اور اب تک اس نے اس سلسلہ میں جو تغافل برتا ہے، اس کی تلافی اپنی آئندہ کی فعال اور منظم مساعی سے کرے گی۔

یہ کتاب ہمیں پاکستان میں عیسائیت کے روز افزوں فروغ سے متعلق اعداد و شمار ہی نہیں دیتی، بلکہ اس کے متعلق ہر گونہ معلومات بھی مہیا کرتی ہے۔ اس لئے وہ اس بات کی بجا طور پر مستحق ہے کہ ایوان ہائے حکومت سے لے کر عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچے۔ تاکہ ہر طبقہ اپنے دستِ صلاحیتوں اور اثر و رسوخ کے مطابق اپنے دین کی حفاظت کا اہتمام کر سکے۔

حافظ نذر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج نے جنہوں نے اس گراں بہا کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اس کے پیش لفظ میں قوم کے ہر طبقے کو دعوت دے کر ان کا فرض یاد دلا دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کی اس پکار پر کون نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ کہہ کر ان کی طرف دستِ تعاون بڑھاتا ہے۔

جنابِ ناشر سے گذارش ہے کہ موضوع کی اہمیت اور کتاب کی افادیت کے پیشِ نظر اگر وہ اس کا کوئی ارزاں ایڈیشن شائع کر سکیں تو یہ اُن کی مساعی جمیلہ میں اور اضافہ ہوگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کتاب تمام طبقوں تک رسائی ہو جائے گی، اور متوسط طبقے کے افراد کیلئے بھی ممکن ہو جائے گا کہ وہ اس کا مطالعہ کر سکیں۔

کاغذ، کتابت، صحتِ لفظ اور طباعت، غرض ہر پہلو سے حضرتِ ناشر نے کتاب کو دلآویز اور نظر افروز بنا دیا ہے۔ فَشَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہٗ!

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

★ ضخامت ۲۳۶ صفحات ★ سائز بڑا ★ طباعت آفسٹ

مجلد مع گردپوش ★ قیمت فی نسخہ: چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:

مکتبہ تنظیم اسلامی، ۴-اے، مزنگ روڈ - لاہور

پرنٹر: چوہدری رشید احمد - مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور سے شائع کیا

MONTHLY MEESAQ LAHORE

. 28 | December 1979 | No. 12

سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی

(۱)

قرارداد تاسیس مع توضیحات

بڑے سائز کے ۴۰ صفحات - - - - - قیمت ڈیڑھ روپیہ

(۲)

شرائط شمولیت اور نظام العمل

بڑے سائز کے ۲۸ صفحات - - - - - قیمت ایک روپیہ

(۳)

یعنی تنظیم اسلامی کے داعی و امیر ڈاکٹر اسرار احمد کی وہ تقریر جس
انھوں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا مع مقدمہ بعنوان : ''امت مس
کے عروج وزوال کے دو دور اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی ج
بڑے سائز کے ۱۳۶ صفحات - - - - - قیمت چھ رو

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۴ - اے۔مزنگ روڈ لاہور (فون : 311668)